1448

جزیرے

(آٹھ افسانوں کا مجموعہ)

از

محمد حسن عسکری

مطبوعہ محبوب المطابع، دہلی

طبع اوّل
سنہ ۱۹۴۳ء

قیمت
دو روپے

فہرست مضامین

ستیش چندر دیپ

اُستاد اور رہنما

کے نام

*I can call up old ghosts, and they
will come,
But my art limps — I can not
send them home.*

کالج سے گھر تک

میرا کالج تین بجے بند ہوتا ہے۔

دس بجے سے اس وقت تک کلاسوں میں لیکچر سننا اور خالی گھنٹوں میں بنچوں پر پہلو بدلنا، ہاتھوں سے چہرہ رگڑنا، ماتھا سہلانا، انگڑائیاں لے لے کر کوفت دور کرنے کی کوشش کرنا ہی کچھ کم تھکا دینے والا نہیں ہوتا، اور اوپر سے آخر میں اکنامکس کی خشکی اور لیکچرار صاحب کی بھدی موٹی اور تھکی ماندی آواز اس احساس کو اور بھی تیز کر دیتی ہے، کلاس سے نکل کر قدم آہستہ آہستہ بے ترتیبی سے پڑتے ہیں، سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوتا ہے۔ اور کتابیں نیچے ہاتھ میں لٹکی جھولتی رہتی ہیں۔ سڑک پر پہونچکر اس خستگی میں کچھ کمی ہوتی ہے، اور پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ اب کل دس بجے تک کیلئے آزادی ہے۔ یہاں میں ہلکا سا سانس لیتا ہوں، اور پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں وہ سامنے اکنامکس کا کمرہ نظر آرہا ہے۔ میں فوراً گزرتے ہوئے یکوں اور سائیکلوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔

مجھے جانا تو ہوتا ہے ڈیڑھ میل، اور گرمی کا گرم سورج میرے ننگے سر کے ساتھ کچھ بہت زیادہ خوش سلوکی سے پیش نہیں آتا۔ مگر پھر بھی میں قدم بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا ـــــ نہیں کرنا چاہتا۔ آخر چوبیس گھنٹے میں یہی تو وقت ہوتا ہے جب سکون کے ساتھ کسی بات پر غور کیا جا سکے۔ صبح سے اٹھکر پڑھنا وڑھنا لگا ہی رہتا ہے۔ کالج جاتے ہوئے یہ بے چینی ہوتی ہے کہ

کہیں گھنٹہ نہ بج جائے ـــــ بس بھاگم بھاگ۔ اور شام کو ٹہلنے میں ہلکی ہلکی ہوا کمبخت دماغ کو پتھر کا بنا دیتی ہے، نہ کچھ سوچ سکو اور نہ کچھ.... بس جوتا پھٹ پھٹاتے جاؤ اور آ کر پڑ رہو۔ رات کا وقت تو خیر بنا ہی ناول پڑھنے کے لئے ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ کالج سے آنے کے وقت کے علاوہ اور کونسا وقت فرصت کا رہ گیا۔ آخر گھر ہی پہونچنا ہے نا؟ پہونچ ہی جائیں گے اپنے آہستہ آہستہ! پھر جلدی کاہے کی؟

ذرا آگے چل کر تراہا آجاتا ہے۔ یہاں سے اس سڑک پر میرے سوا کالج کا کوئی لڑکا نہیں ہوتا، اور تانگوں وغیرہ کی آمدورفت بھی معمولی ہی سی ہوتی ہے، اس لئے مجھے سوچنے کے لئے اور بھی اچھا موقع مل جاتا ہے۔

میرے ڈھیلے ڈھالے بدقطع کپڑوں اور چال ڈھال سے لڑکے مجھے نرا گاؤدی سمجھتے ہیں، میں جو خواہ مخواہ دخل در معقولات نہیں کرتا، اور اخباروں کے شذرات پڑھ پڑھ کر سیاسیات پر اٹھائیں سنائیں بحث کرنے کو بیکار خیال کرتا ہوں تو وہ لوگ سمجھ بیٹھے ہیں کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ جب وہ نئے قانونوں، اسمبلی کی تقریروں یا شاعروں کی قدر و قیمت کے متعلق سرگرمی سے بحث کرتے ہوتے ہیں تو میری طرف پیٹھ کر لیتے ہیں جیسے یہ معاملات مجھ سے بالاتر ہیں۔ اچھا پھر سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں، میرا ہی کونسا بڑا ہرج ہو رہا ہے۔ آخر اور بھی تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کو اُن کے زمانے والے بیوقوف سمجھتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ بھی ٹھیک، مگر اُن لوگوں کے سامنے مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی چیز کم ہے، اور میں بار بار اپنے آپ کو اُوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوں۔ لیکن یہاں سڑک پر؟.... یہاں کون بیٹھا ہے جو مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ یہاں تو میرا جس طرح جی چاہے چلوں، منہ بناؤں، ہاتھ ہلاؤں۔ بیچارے راہ گیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنستے پھریں.... اور آخر میں اُن سے کسی بات میں کم بھی تو نہیں ہوں۔ سیاست... بین الاقوامی معاملات.... ادب.... کیا نہیں آتا مجھے؟ ـــ بڑے آزاد خیال بن کر چلے ہیں وہاں سے ـــ مجھے دیکھیں، میں تو خدا کو بھی نہیں مانتا۔

وہ تھے نہ مولانا جواد علی جو جمعیۃ العلما کی طرف سے تبلیغ کے لئے آئے تھے اور ہمارے ہی محلے میں ٹھہرتے تھے، کیسے کیسے میرے پیچھے پڑے ہیں، مگر میں نے ہی نہ دی حضرت کو پڑھ کر نماز، کہیں یہ لوگ ہوتے تو دم سادھتے ہی بنتی، اور ہاں پھر میرے کمیونسٹ خیالات!

ایسے موقعوں پر اگر میں اپنی کھدّر کی سفید والی شیروانی پہنے ہوتے ہوں، اور اُس کے دامن ہوا سے دونوں طرف اُڑ رہے ہوں تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں گویا میں ایک سفید پروں والا فرشتہ ہوں، اور سڑک پر چلنے والے آدمیوں سے اونچا ہو گیا ہوں۔ ہوا جب میرے بالوں اور کانوں کے بیچ سے گذرتی ہے تو میری کن پٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، میں اپنا قد سپاہیوں کی طرح سیدھا کر لیتا ہوں، اور شیروانی کا دامن ایک ہاتھ سے پکڑ کر تھوڑی دیر تک ذرا تیز چلتا ہوں۔

لیکن مجھے یہ بھی تو چاہیئے کہ ان لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دوں کہ میں اُن سے کچھ ہیٹا نہیں ہوں۔ اچھا تو آئے دو ایک ڈیبیٹ..... مگر..... نہیں۔ مذاق اُڑائیں گے شریر کہیں کے.. .... پھر کالج کے میگزین ہی میں ایک مضمون لکھ ڈالوں۔ لیکن اگر نہ لیا میرا مضمون تو.....؟ کیا کرنا چاہیئے..... کیا..... کرنا..... ٹھیک، ٹھیک! اگلے چھٹیوں میں جو گھر جانا ہو تو اپنے پُرانے اسکول میں ایک تقریر کر ڈالوں۔ یہ لوگ تو واقعی میری تقریر نہ سُن سکیں گے، مگر خیر مجھے تو تسلّی ہو ہی جاتے گی کہ میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں..... بس تو یہی طے ہے..... ہاں پھر تقریر کا مضمون کیا رہے گا۔

میں ذرا دیر اپنا چہرہ کھجاتا ہوں، اور پھر تقریروں کے عنوان اور اُن کے متعلق فقرے ذہن میں چکّر لگانے لگتے ہیں..... موجودہ بین الاقوامی معاملات..... فش..... روس کی معاشری حالت..... ہوں، ہوں —— لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن —— کوئی دوسرا... ورڈسورتھ کی شاعری... نہیں نہیں —— "آج روس میں ہر ہر کسان......" مگر اس بات کا تعلق تو پہلے والے مضمون سے ہے.... اچھا پھر... ادب اور زندگی.... یہ ٹھیک رہا۔ آخر جاننا

چاہیئے کچھ بے چارے ان اسکول کے لڑکوں کو بھی۔ انہیں پڑھایا جاتا ہے کیا۔ بس وہی غالب ..... شمارِ سبحہ مرغوب بُتِ مشکل ..... بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہوئی ..... ہونہہ ..... تو بس یہ مضمون ٹھیک رہا۔

اچھا اب اسے شروع کس طرح کیا جائے گا؟ ..... پہلے تو اپنی کم استعدادی کا اعتراف، اور پھر معافی کا مطالبہ وغیرہ ..... "معزز اساتذہ اور بھائیو"..... انگریزی میں کہتے ہیں لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ مگر عورتیں تو ہوں گی نہیں ..... تو پھر یوں ..... "غیر حاضر خواتین اور حاضر بھائیو" ..... اس سے ایک ہنسی کی بات تو کہہ دی گئی نا ..... "آپ سب مجھے جانتے ہیں ..... میں نے اسی اسکول میں پڑھا ہے ..... میں کچھ زیادہ تو جانتا نہیں، مگر آپ کی خدمت کے شوق میں حاضر ہو گیا ہوں ..... میری غلطیاں معاف کریں گے"..... اب کوئی لطیفہ، شعر ..... شعر ہی سہی ..... یہ مصرع مناسب ہوگا۔ یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ ..... پڑھ کر دیکھ لینا چاہیے ..... میں چاروں طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ منہ پر اس انداز سے رکھ لیتا ہوں کہ ہونٹوں کے ہلنے کو کافی جگہ رہے، اور ہلکی آواز میں پڑھتا ہوں۔

یہی زندگی ..... حقیقت ..... یہی زندگی ..... فسانہ۔

"آپ لوگ غالب کا کلام پڑھتے ہیں، قصیدے پڑھتے ہیں، غزلیں پڑھتے ہیں، کیوں پڑھتے ہیں؟ لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ کبھی آپ نے سوچا؟ بتائیے ..... آپ اس لئے ......" یہاں میری مٹھی بند ہو جاتی ہے، اور ہاتھ اوپر اٹھنے لگتا ہے، مگر میں شرما کر اسے جلدی سے نیچے کھینچ لیتا ہوں ..... "آپ اس لئے پڑھتے ہیں شعر کہ آپ زندگی ....." ہاں ہاں یہ ظالم زندگی ..... "کہ آپ زندگی کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے گہرے رازوں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان سمندروں کی تھاہ لانا چاہتے ہیں۔ اور شاعر کو بھی ....."

گھوڑے کی ٹاپوں کی زوردار آواز مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے ..... ہاں، وہی تو ہے لڑکیوں کا تانگہ مجھے اکثر ملتا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ ہمیشہ

ایک ہی انداز سے بڑی تمکنت کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں، اور وہ کبھی مجھ سے نگاہیں چرانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ میری طرف دیکھتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ بیضوی، سفید اور بھرا ہوا ہے! اس کے ہونٹ خوب سرخ ہیں، اور ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں، کاش مائیکل انجلو اس کا مجسمہ بناتا... لیکن مجسمہ پھر بھی بے جان ہی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں تو عموماً مجسمہ میں پتھرائی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ مونا لیزا کا مصور ہی کچھ اس کی نقاشی کرے تو کرے۔ خاص طور سے اس کا سینہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی سفید جالی دار ساڑھی اور ہلکے جمپر میں سے اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہوں..... سفید، ملائم اور سڈول..... میں چھو سکتا! اگر کہیں وہ بھی میری تقریر سن سکے تو مزا ہی آجائے..... ممکن تو ہے...... ابھی تو چھٹیوں میں بہت دن پڑے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عرصے میں میری اس سے ملاقات ہو جائے اور اتنی راہ و رسم بڑھ جائے کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکوں۔ پھر تو مجھے دوسری طرح تقریر شروع کرنا پڑے گا۔ میں کہوں گا: "ایک خاتون اور بہت سے حضرات!" سب ہنس پڑیں گے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی دیکھ کر کیسا رشک ہوگا لوگوں کو اور میں خوشی سے دیوانہ ہو جاؤں گا۔ اپنے پرانے انگریزی کے ماسٹر صاحب سے ضرور تعارف کراؤں گا اس کا!..... تانگہ گزر بھی چکا ہوتا ہے، اور میں اسی کے خیال میں غرق، اپنے نچلے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے رگڑتا ہوا، سر لٹکائے، بائیں ہاتھ سے کتابیں دل کے قریب چپٹائے ہوئے، اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے برابر والی انگلی کو ملتا ہوا، آہستہ آہستہ لڑھکتا رہتا ہوں۔

سورج کی گرمی سر کو جھلس کر رکھ دیتی ہے، بدن میں چنگاریاں لگنے لگتی ہیں، اور جسم پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ بے قرار ہو کر میں یکایک تیز چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ آگے درختوں کا سایہ آتا ہے جو کافی دور تک چلا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر میں لپکتا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سر کو چکرا دیتی ہے، اور میرا دماغ تیز لہروں کی دھار پر گھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہر قسم کے خیالات میرے ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور میری رفتار بہت دھیمی پڑ جاتی ہے۔

درختوں کے ختم کے قریب سڑک کے کنارے ایک کمہار کا گھر ہے۔ درختوں کے سائے میں اُس کی لڑکی اپنا چاک رکھے آبخورے بنایا کرتی ہے، وہ گھٹنوں سے اُوپر تک کا پھٹا سا لہنگا اور آدھی باہنوں کا دھاری دار کرتا پہنے رہتی ہے اور اس کی اوڑھنی ڈھلک کر کندھے سے نیچے گر جاتی ہے، اُسے اپنے تندرست اور نیم رس سینے کو ڈھکنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی، جس کا کافی حصّہ گریبان میں بٹن نہ ہونے سے راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُس کے سوکھے ہوئے سخت بالوں کے گچھے اور لٹیں بن گئی ہیں جن میں سے اکثر اُس کے تانبا جیسے اور جابجا مٹّی سے سنے ہوئے چہرے پر لٹکتی رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے ڈنڈے سے چاک کو گھماتی ہے تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُس کی ٹانگیں بے پروائی سے چاک کے دونوں طرف پھیلی رہتی ہیں، اور اس کی برہنہ چکنی پنڈلیوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے اپنی تقریر پھر یاد آجاتی ہے، اور میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں، میری بھنویں چڑھ جاتی ہیں اور میں بہ مشکل اپنے لفظوں کو ہونٹوں تک آنے سے روکتا ہوں۔

"آپ نے اپنی شاعری میں قوسِ قزح کی رنگینی اُڑا لی، اُسے گل و یاسمن میں بسا دیا، موجِ نسیم کے گہواروں میں پالا، بادۂ ناب اور مئے انگوری کی کیفیتیں اس میں بھر دیں، اور طور کی تجلّیوں سے اسے ضیا بخشی.... لیکن —— آپ نے زندگی سے کیا لیا —— زندگی.... میرا مقصد ہے زندگی.... کیا آپ نے کبھی خونِ گرمِ دہقان کی جھلک دیکھی؟ کیا آپ نے مزدور کی کمر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی؟ کیا آپ نے.... اُن مضبوط لیکن فاقہ کش اور بدحال مزدورنیوں کی جفاکشی کے گُن گائے؟...... اگر نہیں تو آپ بے خبر سوتے رہے...... آپ نے آنے والے انقلاب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں.... ہوشیار.... بیدار ہو جائیے.... اُٹھئے اور اپنے ادب کا......"

موٹر کے ہارن کی متواتر آوازیں مجھے جگا دیتی ہیں، اور میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔

یہ موٹر میری کلاس کے ایک کالے اور بدشکل لڑکے کی ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھتا ہے، اور مجھے ضرور پہچانتا ہوگا۔ مگر اپنی موٹر میں گذرتے ہوئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو ناک سکیڑ کر دوسری طرف منہ کر لیتا ہے۔ کرتا ہے تو کر لے، مجھے کیا۔ ایسا کہاں کا لاٹ صاحب ہے بڑا۔ اور ہو بھی تو کیا ہے۔ انقلاب بھی تو نزدیک آرہا ہے، اور تھوڑے دن چین کر لے، پھر کھل جائیگی حقیقت! ..... اپنے منتقمانہ ارادوں کے پورا ہونے کی اتنی قریب امید پر ایک پُر رمز مسکراہٹ میرے ہونٹوں تک آجاتی ہے، اور اس طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنی تقریر سوچنے لگتا ہوں۔ اسوقت مجھے سلسلے کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی، کیونکہ ابھی تو خیالات کو جمع کرنا ہے، اُن کی مناسب ترتیب تو موقع پر ہوتی رہیگی۔

کسی مشہور انگریزی مصنّف کا قول بھی آنا چاہیئے تقریر میں۔ آخر لوگوں کو یہ معلوم تو ہو کہ ہم نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اچھا تو پھر کونسا مصنف ..... میتھیو آرنلڈ ..... "ادب تنقیدِ حیات ہے"..... مگر نہیں، چھوڑو، بہت پامال ہے یہ ..... شیلی کا وہ شعر "ایسی ایسی شکلیں جو بقا کی پروردہ ہیں"..... لیکن یہ تو میرے مقصد کے خلاف رہے گا؟۔ مجھے تو زندگی کے متعلق کہنا ہے ..... پھر؟ ..... شاید لینن نے کہا تھا کہ "یہ سر ہلانے کا وقت نہیں ہے بلکہ سر توڑنے کا ....." لیکن کوئی ٹھوس چیز ہونی چاہیئے ..... کس نے لکھا ہے وہ؟ ..... والٹر پیٹر ..... بینٹ ..... فرائڈ ..... خیر، کوئی بھی سہی۔ یوں کہا جا سکتا ہے "کتنی اچھی بات کہی ہے ایک انگریز نقاد نے کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے، زندگی سے نشو و نما پاتا ہے، اور زندگی پر ہی اثر انداز ہوتا ہے"۔ اپنے میں یورپ کے مصنّفین کے اقوال نقل کرنے کی صلاحیت پا کر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنی تقریر کو بھول کر کچھ دیر اسی خیال سے لطف اُٹھاتا رہتا ہوں، اور بار بار مسکرا پڑتا ہوں۔ میں اُس دن کا تصوّر کرتا ہوں جب میں اپنی تقریر میں یہ اقوال دُہرا رہا ہوں گا ..... لڑکے میری قابلیت پر تعجب کریں گے، فارسی کے ماسٹر صاحب گردن بڑھا بڑھا کر مجھے گھوریں گے۔

مرعوب تو وہ بھی ہو رہے ہوں گے، مگر اس پر جھنجلا رہے ہوں گے کہ میں نے ابھی تک فارسی کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا۔ اور آخر میں کیوں پڑھوں صاحب۔ بھلا کہاں آنگ۔ بیزی کہاں فارسی!.... گھر جاکر بھی تو لڑکے ـــــ

"ارے، ہٹتے بھی ہو آگے سے کہ نہیں!" ایک پسینے میں شرابور اور سر سے پیر تک سیاہی سے اٹا ہوا مزدور کوئلے کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے کو کھینچتے ہوئے پیچھے سے پکار کر کہتا ہے، اور ساتھ ہی زیرِلب ایک غیر شگفتہ اصطلاح کا اضافہ بھی کرتا ہے.... ان لوگوں کی ایسی باتوں سے میرے دل کو ایک دھکّہ سا لگتا ہے..... ہمارا تو یہ حال کہ ہم ان کی حمایت میں تقریریں سوچیں، ان کی خاطر سرمایہ داری کے خلاف دانت پیسیں، ان کی حالت پر افسوس کریں..... اور ان کا ایسا سلوک ہمارے ساتھ؟...... کیا حالت ہے دُنیا کی بھی..... اپنے ہمدردوں کا بھی تو لحاظ نہیں کرتے یہ لوگ... نہ جانیں، نہ پہچانیں،.... جانور کہیں کے۔ میں ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب اپنی تقریر کا موضوع بدل دوں گا، اور اقبال کے فلسفۂ حیات پر بولوں گا..... مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کچھ ایسا قصور بھی تو نہیں ان بیچاروں کا.... جاہل ہی ہیں نا آخر... چھوڑو بھی، اپنی طرف دیکھو۔

ہاں تو...." وہ ادب جو زندگی سے رشتہ مضبوط رکھے، جو زندگی کی ترجمانی کرے .... جو.... زندگی..... زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ اور ساتھ ہی ایک مریل گھوڑے پر بیٹھے والے کے چابکوں کی سڑاسڑ ـــــ" ایک مرتبہ یونانیوں نے اپنے ایک شاعر کو اس لئے سزا دی تھی کہ وہ ان کی زندگی کے مصائب اپنے شعروں میں بیان کیا کرتا تھا...... زندگی مصائب سے پُر ہے..... مصائب.... ظلم..... بے انصافی ..... اور یہ مزدور..... "

میرا خالی ہاتھ کبھی اوپر آتا ہے، کبھی نیچے جاتا ہے، اور کبھی گھونسے کی شکل اختیار کر کے ہوا کو مارتا ہے، میرے ہونٹ بھی کچھ ہلتے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا احساس سوقت

ہوتا ہے جب دو اسکول کے لڑکے اپنی سائیکلوں پر میرے پاس سے گذرتے ہیں اور مجھے دیکھکر قہقہہ مارتے ہیں، میرے خون کی گردش رک سی جاتی ہے، اور کن پٹیاں بھاری اور گرم ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں آہستہ آہستہ اپنے بدن کو ڈھیلا کر لیتا ہوں، اور پھر........

"آپ لوگ اب بڑے ہونے والے ہیں، آپ کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہیئے... بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے..... اب آپ لوگوں کے ہاتھ بات ہے، آپ کو نیا ادب پیدا کرنا ہے.... زندگی سے باہر آپ کہاں جا سکتے ہیں، زندگی ایک چیستاں ہے... غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھئے زندگی کو.... ایک شاعر ہے آجکل انگریزی کا۔ وہ کہتا ہے کہ میں محبت کرتا ہوں چائے کی پیالیوں سے، کمبلوں سے، ریل کے......"

"چھوڑئیے نہ دیجیے نندؔ"— بگلا نندر چیخ چیخ کر گا رہا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی سڑک پر ناچتا بھی جاتا ہے، لڑکے اُسے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں، اور خود بھی چلاتے جاتے ہیں "کیا کہنے ہیں سجرو سیٹا کے" پوسا پکوڑی والا دور بیٹھا لڑکوں کو شہہ دیتا رہتا ہے۔ یہ پوسا پنواڑی کی دکان کے قریب پیپل کے نیچے چبوترے پر بوری بچھائے بیٹھا کڑوے تیل میں پکوڑیاں بیچا کرتا ہے جس کی چراہند دور دور پھیلی رہتی ہے۔

اب گھر اتنا نزدیک آ جاتا ہے کہ تقریر کے متعلق کچھ اور سوچنا مشکل معلوم ہونے لگتا ہے۔ باقی حصے پر کل غور کرنے کا ارادہ......... کر کے میں چال کو تیز کر دیتا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے بارش آ گھیرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر بادل گھنٹہ ختم ہونے پر اٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان کی دہشت ناک شکل کو ذرا خاطر میں نہیں لاتا۔ سورج کی جھلسن کا پتہ بھی نہیں ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں طبیعت کی روانی کا کیا پوچھنا— جیسے چلے جا رہے ہوں ہلکے ہلکے اڑتے ہوئے: اور پھر یہ لازمی تھوڑی ہے کہ بارش ہو ہی، میں اپنی تقریر سوچتا ہوا چل دیتا ہوں— اور دنوں سے بھی آہستہ۔ خطرے کے نزدیک ہونے کا احساس مجھے اس وقت ہوتا ہے جب یکے اور تانگے پوری رفتار سے

گھڑگھڑاتے ہوئے دوڑنے لگتے ہیں، سائیکلوں کی گھنٹیاں بے تحاشہ زور زور سے بجتی ہیں، اور گھاس والیاں ایک ہاتھ سے اپنے لہنگے سنبھالتے ہوئے یہ کہہ کہہ کر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں کہ "بھاگو بھائی، پانی آیو" میں بھی گھبرا کر جلد جلد قدم بڑھاتا ہوں ـــــ موٹی موٹی بوندیں پڑتی ہیں۔ اب میں بھاگنے کی تیاری کرتا ہوں۔ مگر بارش ایک ساتھ آجاتی ہے ..... یوں ہوتے کو تو میں حاجی غلام رسول ٹرنک ساز کی دکان میں پناہ لے سکتا ہوں، اور ایک دفعہ میں نے کیا بھی یہی تھا۔ بارش جو آئی تو میں سیدھا حاجی جی کی دکان پر چڑھ گیا۔ حاجی جی لکڑی کی کرسی پر دونوں پیر اوپر رکھے بیٹھے تھے، اور حقہ پیتے ہوئے کسی سے باتوں میں مشغول تھے۔ میں بھی کھڑا ہو کر سننے لگا۔ اسکول کی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے اپنے مخاطب کی طرف جھک کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا "اور بھئی لوبیسوں واقعے تو خود مجھے معلوم ہیں جب بورڈنگ کی لڑکیوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ آخر کچھ حد ہے بے حیائی کی!"

میں بھی بول اٹھا "لیکن جب آپ کی بھینس بچہ دیتی ہے تو اُسے بے حیا کیوں نہیں کہتے؟"

حاجی جی نے اس غیر متوقع جارحانہ حملے کو، جس نے انہیں ہڑبڑا دیا تھا، کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، اور ڈاڑھی کو اس طرح اوپر اٹھاتے ہوئے بولے گویا وہ بھی اُن کی دلیل کا ایک حصہ ہے "تو آدمی اور بھینس کی کیا مثال؟"

"بھینس آدمی نہیں ہوتی کیا؟" میں نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"بھینس آدمی؟" حاجی جی کے حقے کی نے نیچے گر پڑی۔

"ہاں آدمی، یعنی یہ کہ ..... جاندار تو ہوتی ہے"

میری اور حاجی جی کی خاصی جھڑپ ہو گئی جس کے دوران میں انہوں نے میری ذات کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں میرے وہاں کھڑے رہنے پر فی الحال کوئی

اعتراض نہیں تھا، مگر میں بارش کے باوجود وہاں سے چل دیا۔ جب سے میں کبھی ان کی دکان پر نہیں جاتا، چاہے کتنے ہی زور کی بارش کیوں نہ آ جائے۔ اور پھر بارش ہمیشہ اسی وقت آتی ہے جب میرا ایک تہائی کے قریب راستہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے میں سیدھا بھاگ ہی لیتا ہوں۔ بارش کا زور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ بوچھار آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے۔ کتاب کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر کپڑوں پر ٹپکنے لگتا ہے۔ مگر میں بھاگے ہی چلا جاتا ہوں۔ بارش کے وقت پوسا پکوڑی والا اپنا سامان بنواڑی کے تخت کے نیچے سرکا دیتا ہے، اور چبوترے پر پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کبھی ایک دھوتی کے سوا اور پہنتا ہی کیا ہے، اس وقت تو وہ دھوتی کو بھی اوپر چڑھا لیتا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر زور سے گاتا ہے: "برسو رام جھڑاکے سے، بڑھیا مر گئی پھاکے سے"!

جب میں بھاگ رہا ہوتا ہوں تو اس کی آواز ایک عفریتانہ تمسخر کے ساتھ، تند، کرخت، ایک دھمکی لئے ہوئے، بارش کی دھار کو چیرتی پھاڑتی میرے تعاقب میں دوڑی چلی آتی ہے۔

—— برسو رام جھڑاکے سے!

میں اپنے مکان کے سامنے کے میدان کو گھوڑوں کی لید اور کیچڑ میں پھنستے ہوئے اور پرنالوں کے پانی میں پچ پچ کرتے ہوئے، طے کر کے سر سے پیر تک پانی میں ڈوبا ہوا زینے کے دروازے تک پہونچتا ہوں۔ جیب سے چابی نکالنا چاہتا ہوں تو جیب ایسی چپک جاتی ہے کہ چابی بڑی مشکل سے ہاتھ لگتی ہے۔ پھر تالا بھی کھلنے میں وقت پیدا کرتا ہے۔ جلدی جلدی اوپر پہنچکر میں کتابوں کو چارپائی پر پھینک دیتا ہوں۔ شیروانی کو آہستہ آہستہ اتارتا ہوں، اور اسے الٹ پلٹ کر نہایت غور سے دیکھتا ہوں گویا میری نگاہ کی گرمی سے وہ خشک ہو جائے گی یا اس کی رگڑ سے کتاب کا بہا ہوا رنگ چھوٹ جائے گا۔ پھر میں اسے نہایت احتیاط سے کواڑ پر ٹانگ دیتا ہوں، اور بغیر کپڑے اتارے، بالوں کو تولئے سے سکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اتنے میں چھدن سینگے والا اوپر چڑھ آتا ہے، اور کواڑ سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ تیز نظروں سے حالات کا جائزہ لیتا ہے، اور پھر چونکتے ہوئے مسکرا کر کہتا ہے۔—

"کہو بابوجی، بھیگ گئے آج؟" اور ساتھ ہی اُس کے دھکے سے شیروانی کواڑ پر سے نیچے کچی زمین پہ گر پڑتی ہے اور مٹی میں سن جاتی ہے۔

اور یہ وہی میری کھدّر کی سفید والی شیروانی ہوتی ہے۔

. . . .

اگلے دن میں دُنیا کے آئندہ نظام کے متعلق تقریر سوچتا ہوں۔

"ادبی دُنیا" اگست ۱۹۴۵ء ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء

پھسلن

جمیل کا تو اس طرف خیال تک نہ گیا تھا، مگر ذاکر کے غیر متوقع طرزِ عمل نے اس کے دل میں بھی دلچسپی، ورنہ کم سے کم کھرچن سی تو ضرور، پیدا کر دی۔ وہ ہُوا یوں، کہ ایک دن عصر ولے سے میں ذاکر جمیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے پلنگ پر بیٹھا تھا کہ یکایک اندر سے نذرو نمودار ہوا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک کر کمرے کے باشندوں کا جائزہ لیا، اور پھر شانے چوڑے کئے، سینہ اُٹھائے، اپنی موٹی، میلی، سوتی بنیائن کی جس کے مختلف رنگ عرصے کے استعمال سے گھل مل کر اب ایک چتّیوں دار شعوری رنگت میں تبدیل ہو چکے تھے، آدھی آستینوں سے نکلی ہوئی باہوں اور ٹخنوں سے اُونچی دھاری دار تہمد لہراتا، بغیر کسی طرف دیکھے، اپنے گلے کے سیاہ ڈورے کو ہاتھ سے گھماتا ہوا لاپرواہی سے سیدھا میز کی طرف چل دیا۔ نذرو کے داخل ہوتے ہی ذاکر کی بھنویں اُوپر اُٹھ گئی تھیں، اور اُس کی آنکھیں نذرو کے چہرے پر گڑ سی گئی تھیں۔ نذرو کے چلنے کے ساتھ ساتھ ذاکر کی آنکھیں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلیں، اور جمیل کی کمر کے گرد اُس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ نذرو کے جاتے ہی اُس نے جمیل کے کندھے کو جھٹکا دے کر، بایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر فیصلہ کن انداز سے رکھتے ہوئے، ایک بھوں اُوپر چڑھا کر، اور دوسری نیچے کھینچ کر، ترچھی سلوٹوں سے سجتے ہوئے ماتھے اور طنز سے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں، بھئی؟"

"ارے! تمہیں نہیں معلوم؟" اور اس کے یہاں ذاکر کی آمد و رفت کی تعداد کو دیکھتے ہوئے جمیل کا تعجب بے جا بھی نہ تھا۔ "یہ نوکر ہے ہمارا نیا ـــ نذرو.... کمال ہے یار تمہیں اب تک خبر نہ ہوئی.... ہیں؟"

اس سوال کے جواب کی اہمیت پر غور کئے بغیر ذاکر نے کہا "یعنی آپ کو بھی یہ شوق ہوا۔ یہ کب سے؟ کیا ارادے ہیں آخر؟" اسکی شک و شبہ سے بھری ہوئی آنکھوں کی تیزی اور چمک، اور ان کے جھکے ہوئے کناروں کے ساتھ اب دونوں ہونٹ بھی ہنسنے کے لئے کھل چکے تھے۔

جمیل کا دل نہ چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو محض مذاق سے زیادہ وقعت دے، مگر اس نقطۂ نظر کے انوکھے پن نے اُسے ایسا مجبور کر دیا کہ شام تک جتنی مرتبہ بھی نذرو اس کے سامنے آیا، اس نے اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھکر اس نظریہ کی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر ہر دفعہ ہی فیصلہ کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوا کہ ذاکر صرف اُسے چڑا رہا تھا۔ تاہم اُسے اپنے نئے نوکر کی شخصیت کچھ عجیب و غریب، اجنبی اور پُر رمز ضرور معلوم ہو رہی تھی، آج سے نہیں بلکہ پہلے ہی دن سے۔ وہ آکر برآمدے تک آیا نہ تھا، اپنے ہاتھوں کو پیٹ کے اوپر ایک دوسرے پر رکھکر دھوپ میں جا کھڑا ہوا تھا، اور، ہاں، اُس نے کسی کو سلام تک نہ کیا تھا۔ جب اُس سے نوکری کرنے کو پوچھا گیا، تو اُس نے اپنے آپ پر پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا "ہاں، ہاں، جی۔ کیوں نہ کریں گے؟" اُسے دعویٰ تھا کہ وہ ہر کام کر سکتا ہے۔ جب اُس سے تنخواہ کے متعلق سوال کیا گیا، تو اُس نے اپنا زردی مائل بے رنگ لمبا عمامہ اُتارا، اور اُسے جھاڑ کر دوبارہ باندھتے ہوئے ایسے انداز میں کہا گویا تنخواہ آخری چیز تھی جس سے اُسے دلچسپی ہو سکتی تھی: "اجی، جو بھی جی چاہے دے دینا!" اور اُس نے تین روپے پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ دو دن تک وہ بہت خاموشی اور سستی سے اپنا کام کرتا رہا۔ مگر تیسرے دن اُس نے بالکل غیر متوقع طرزِ گفتگو اختیار کیا۔ جب جمیل اسکول جانے سے پہلے باورچی خانے میں بیٹھا کھانا

کھا رہا تھا، تو نذرو نے نہایت رازدارانہ لہجے میں کہا: "اجی آج ایک سالی عجیب بات ہوئی۔۔ سناؤں میں، جمیل میاں، وِس کو نہیں؟" نذرو کے تنے ہوئے کان، گول گول پھرتی ہوئی آنکھیں، ہنسی میں کھلے ہوئے ہونٹ، اس کی ناک کے دونوں طرف سرخی کی جھلک، اور گالوں میں پڑے ہوئے گڑھے دیکھ کر جمیل ہچکچایا، اور اس کے منہ سے نوالے میں سے پھنستی پھنساتی ایک نیم رضامند "ہوں" نکلی۔ نذرو کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی "یہ جو برابر میں لالہ رہتے ہیں نا، اجی یہی دیوار تلے" نذرو ہر شخص اور ہر چیز کی بہن کے بارے میں اپنے فاسد خیالات کا بلاجھجک اظہار کیا کرتا تھا، اور اس وقت بھی وہ اسے چھپا نہ رہا تھا "تو آج جو میں ذرا کوٹھے پہ گیا، جمیل میاں، تو کیا دیکھا کہ وِس کی بیوی سالی بس بالکل ویسے ہی بیٹھی تھی،... بس ایک ساڑھی لپیٹ رکھی تھی وِس نے۔ اور اب کیا بتاؤں بھئی لو..... لاحول بلا، لاحول بلا۔ سب دکھائی دے رہا تھا..... تو جی، اتنے میں آیا وِس کا میاں.... لالہ" نذرو اور قریب کھسک آیا تھا، اور جمیل کا سارا چہرہ گلابی ہو گیا تھا اور وہ جلدی جلدی نوالے توڑ رہا تھا "تو جی، وِس نے آتے ہی وِس کو لے کے پلنگ....." جمیل کے پھندا لگ گیا، اور وہ کھانستا ہوا گھڑوں کی طرف بھاگا، اور پانی پی کر سیدھا چل دیا۔ اس کے کسی نوکر نے پہلے کبھی اس سے ایسا ذکر نہ کیا تھا۔ اس چیز نے اسے شش و پنج میں ڈال رکھا تھا۔ اور پھر آج کی ذاکر کی باتیں۔ وہ نہایت مضبوط دلیلوں اور مثالوں سے اس سب کی اہمیت کم کرنے اور اسے کوئی غیر معمولی چیز نہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر اسے اپنے فیصلوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

اگلے دن تک یہ بات اسکول میں بھی پہونچ گئی۔ درمیانی وقفے میں جب نویں کلاس کے لڑکے نیم کے پیڑ کے نیچے جمع ہوئے تو ایک پوری ٹولی نے جمیل کو گھیر لیا۔

"اُو نچے جا رہے ہیں بھئی جمیل بھی آج کل"

"خیر میاں شکر کرو، یہ اس قابل تو ہوئے"

"ابے ہٹا۔ یہ! اس مرے یار سے آتا ہی کیا ہے سوائے گھوٹنے کے۔ کسی کے سامنے بات

توکر نہیں سکتا، بڑا بنا ہے کہیں کا وہ!"

"مکھیاں مارو گے، بیٹا!" مرزا بیدار بخت نے نصیحت کی۔ "سب بھول جاؤ گے یہ فرسٹ درسٹ آنا!"

جمیل ان سب کے جواب میں جھینپ جھینپ کر رکی ہنسی ہنس رہا تھا، اور خالی نگاہوں سے اُن کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اِسے وقتی تفریح سمجھ کر ٹلا نہ سکتا تھا اور شبھوں کے ساتھ ساتھ اُس کی دلچسپی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اُن چیزوں سے بھی واقف ہونا چاہتا تھا جس کا یہ سب لوگ ذکر کر رہے تھے اور جس کا تخیل اُسکے دماغ میں نہایت غیر واضح سا تھا۔

— وہ بھی علی بابا کے غار میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

اسی دن دوپہر کو مرزا بیدار بخت، ذاکر کو ساتھ لیے جمیل کے یہاں وارد ہوئے۔ انہوں نے اس کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا۔ مرزا جی کو بڑی پیاس لگی ہوئی تھی۔ نذرو انہیں پانی کا گلاس دیکر کھڑا ہو گیا، اور اپنا سر کھجانے لگا۔ مرزا جی نے پانی پی کر گلاس واپس نہیں دیا۔ وہ دو منٹ تک اس کا جائزہ لیتے رہے اور پھر بولے: "کہو دوست، کیا نام ہے تمہارا؟"

"ہمارا نام؟ کیا کرو گے پوچھ کے ہمارا نام؟" اُس نے بے توجہی سے کہا۔

"کچھ بُرائی ہے پوچھنے میں؟"

"ہمارا نام! ہمارا نام ہے سید نذیر علی!" نذرو نے بتلایا۔

"اور نذرو؟" مرزا جی نے پوچھ لیا۔

"اب ہم غریب آدمی ہیں چاہے جو کہہ لو!"

"رہنے والے کہاں کے ہو تم؟ اچھا، بیٹھو، بیٹھو، باتیں کرنی ہیں تم سے!"

نذرو پلنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ یوں تو کبھی کبھی آ کے کرسی پر بیٹھنے میں جمیل کا لحاظ نہ ہوتا تھا، لیکن اس وقت اُس کی نشست بتا رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مواخذے سے مامون سمجھ رہا ہے۔

اُس نے ماتھے اور سر پر اپنا چوڑا اور موٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "اجی کیا پوچھو ہو..... ہم غریبوں کا رہنا رہوا نا۔"

"ابے سالے،" مرزا جی نے پہلو بدل کر ڈانٹا۔ "اکڑ گیا کرسی پہ بیٹھ کے! بتاتا ہے کہ کی جائے قانونی کارروائی تیرے ساتھ؟"

نذرو ایک دم ہنس پڑا۔ اس کا ہاتھ سر سے گھٹنے پر آ گیا۔ پیچھے کھسک کر اس نے مانوس اور مصالحانہ انداز میں ٹانگیں پھیلا لیں، اور بغیر کسی مزید، گو متوقع، سوال کے اپنی پوری سوانح حیات سُنا ڈالی: "رہنے والے تو ہم ہیں عنایت پور کے۔ ہمارے والد ہیں سید مقبول احمد۔ دیکھا ہوگا آپ نے.... بہت آتے ہیں وہ تو شہر۔" مرزا جی کے انکار سے مایوس ہوئے بغیر اُس نے اور زیادہ اعتماد کے ساتھ دوسری شہادت پیش کی: "اچھا، تو یہ ہیں نا سید اشفاق علی، یہ بزار کے نکڑ پر جو رہوتے ہیں ___ موٹے سے ___ بڑی بڑی مونچھیں ___ فونوگراف کے ریکارڈ بغل میں دبائے جو پھرتے ہیں ___ یہی تو ہیں ہمارے خالو ___ سگے خالو ہیں یہ ہمارے.... تو ابا جو تھے ہمارے .... وہ تھے اس قدر کے ظالم کہ بس جب میں پڑھنے نہ جاتا تو مار دیویں تھی ایسی بودی کہ.... دس سال کا تھا میں وس وخت۔ ایک دن جو مارا اُنہوں نے مجھے تو مجھے آیا بڑا غصہ۔ میں بھاگ کے بدلو جلاہے کی بہلیہ پہ جا بیٹھا۔ وس نے اُس سے کہا کہ چل بے دلّی.... شیشے کے کرخانے میں۔ میں وسی کے ساتھ چل دیا۔ بس جی وہ دن ہے اور آج کا دن، قسم لے لو اُس سے جو پھر گھر میں جھانکا بھی ہوں۔ پانچ سال ہو گئے۔ اور یہ والد کی بھی بڑی کوشش، لیکن میں دینا سکے نہ آیا جھانسے میں۔ دلّی میں میں شیشے کے کرخانے میں نوکر ہو گیا تھا۔ کرخانے والا بس بیٹے کے برابر سمجھتا تھا مجھے۔ جو چیز چاہے اُٹھاؤں چاہے رکھوں۔ اور پیسوں کے معاملے میں بیچارے نے کبھی اُس سے نا نہیں کی۔ بڑی محبت تھی وسے اُس سے۔ ایک دن میں رانگ آگ پہ رکھ کے ذرا نیچے بزار میں اُتر گیا، وہاں ایک لونڈا سالا کرنے لگا مجاخ، بس اُسی میں دیر ہو گئی۔ آ کے جو دیکھا میں نے تو رانگ اُلٹا پڑا تھا۔ کرخانے والا بہت بگڑا مجھ پہ۔ خیر ایسی بات کا

تو میں بُرا بھی نہ مانتا، پر وہ مجھے گالی دے بیٹھا۔ دَخت کی بات آگ لگ گئی میرے بدن میں۔ میں وِس سے لڑ کے نکل گیا۔ کئی دن پھر او وہ میرے پیچھے پیچھے خوشامد کرتا ڈاکہ چل، چل، ذرا سی بات کا بُرا مان گیا۔ پر ساب، یہ دیکھو کہ میں نے ہی نہ سُنی وِس کی بات۔ سیّد ٹھہرے پھر تم بھی۔ کوئی رعیت تھے وِس کی۔ وِس سے کہہ دیا میں نے کہ لے تیری خاطر ہم نے دِلّی بھی چھوڑی۔ بس میں وہاں سے یہاں چلا آیا۔"

اُس دن سے مرزا جی، اور خصوصاً ذاکر کی آمد و رفت پہلے کی بہ نسبت بہت بڑھ گئی لیکن جمیل محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی کمر کے گرد ذاکر کے ہاتھ کی گرفت بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ اِن دونوں کو آتے ہی پانی یا پان کی ضرورت پیش آتی تھی، اور جتنی دیر وہ بیٹھتے اس کا زیادہ حصہ وہ نذرو سے دِلّی کے بازاروں، گلیوں، کارخانوں اور لڑکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں گزرتا۔ نذرو کی وہ پہلے والی کسالت، سستی اور خاموشی سرے سے غائب ہو چکی تھی۔ اب اُس کی چال میں پھرتی آ گئی تھی، اور وہ دن میں تین چار مرتبہ مُنہ ہاتھ دھونے لگا تھا۔ اس کا صافہ اب باورچی خانے کی کھڑکی میں پڑا رہتا تھا، اور اس کے چھوٹے گھونگریالے بال، جن پر پہلے خشکی جمی رہتی تھی، کڑوے تیل سے چمکدار اور سیاہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ اپنے بنیائن اور تہمد کو بھی ایک دفعہ کنوئیں پر پچھاڑ چکا تھا۔ اُس کی ٹین کی ڈبیا اب کبھی بیڑیوں سے خالی نہیں نظر آتی تھی، بلکہ اُس کے گلے کا ڈورا بھی ریشمی ہو گیا تھا۔ باتونی بھی وہ اس بلا کا ہو گیا تھا کہ اُس کے دِلّی کے متعلق قصے کبھی ختم نہ ہوتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مرزا جی اور ذاکر اُسے دو اچھے سامعین مل گئے تھے۔ اور ان دونوں سے تو اس کے تعلقات ترقی کر کے دوستانے کے لگ بھگ پہنچ گئے تھے۔ اُنہیں نذرو کے مُنہ کی جھوٹی بیڑیاں پینے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ اُسے یار دوستوں کی سی گالیاں بھی دے لیا کرتے؛ حالانکہ وہ ایک مرتبہ جمیل کے "گدھا" کہہ دینے سے بگڑ اٹھا تھا۔ جب وہ مرزا جی کے جوتے چھپا دیتا تو مرزا جی اُسے پکڑ کر فرش پر گرا دیتے اور اُس کے

گالوں اور سینے پر چٹکیاں لیتے، یہاں تک کہ وہ جوتوں کا پتہ بتا دیتا۔ جمیل نے اکثر اندر سے نکلتے ہوئے ذاکر کی باہوں کو نذرو کے گلے میں دیکھا تھا، مگر وہ اُس کے سامنے آتے ہی ہٹالی جاتی تھیں۔ نذرو نے جمیل کا کہنا ماننا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ اُس کی بات کو اَن سُنی کر دیتا تھا۔ جب جمیل پڑھتا ہوتا تو وہ سامنے چارپائی پر اُلٹا لیٹ کر اونچی، جھنجھناتی ہوئی آواز میں گانے لگتا: "مری جاں جُلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھے ہو" یا "جانی، جُبنا پہ اتنا نہ اترایا کرو"۔ وہ جمیل کے منع کرنے پر بھی نہ مانتا، اور ہنس ہنس کر دوسرا گیت شروع کر دیتا: "وہ چلے پھٹک کے چاول مری منگنی اور بیاہ کے"! جب جمیل ضبط کی آخری حد پر پہونچنے کے بعد غصّے میں سُرخ، دانت کچکچاتا، جوتا لیکر کھڑا ہو جاتا، تو وہ جوتا چھین کر بھاگ جاتا اور پھر ہاتھ نہ آتا، آخر جمیل رونکھا ہو جاتا، اور پھر اس سے نہ پڑھا جاتا، وہ تہیّہ کر لیتا کہ آج ضرور وہ نذرو کو ابّا کے سامنے ماریگا۔ اور گھر سے نکال دے گا۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد نذرو آکر لجاجت سے کہتا: "جمیل میاں، مجاخ کا بُرا مان گئے" تو وہ اپنے ارادے میں ترمیم کر لیتا، اور نذرو کے سر پر دو تین تھپّڑ جما کر جس میں شاید اُس کی باریک اُنگلیوں کو ہی زیادہ تکلیف پہونچتی ہوگی، اپنا غصّہ بھلا دیتا۔ مگر اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نذرو کو جمیل کا خیال نہیں تھا۔ بغیر کہے ہی وہ جمیل کا ہر کام تیار رکھتا تھا۔ اُس کے جُوتے کبھی میلے نہیں رہتے تھے، اور نہ اُس کے کمرے میں گرد کا نشان۔ نذرو اُس کا سرپرست اور محافظ سا بن گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جمیل کو کتابیں صاف رکھنے میں، اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے میں، غرض ہر ہر بات میں بزرگانہ ہدایتیں اور نصیحتیں کیا کرتا۔ وہ مرزا جی اور ذاکر کو بھی اُسے زیادہ تنگ کرنے نہ دیتا تھا۔ جمیل کو نذرو کی یہ حیثیت جو اُس نے قائم کر لی تھی گراں تو ضرور گُذرتی تھی، اور وہ اب اپنے ان دوستوں کے سامنے نذرو کی موجودگی میں اپنے آپ کو ایک کم اہمیت والی شخصیت محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کبھی کبھی صرف ایک ہلکی اور غیر واضح جُھنجلاہٹ سی ہو کر رہ جاتی تھی۔ چنانچہ اُس نے نہایت آسانی سے نذرو کو اپنے اُوپر مسلّط ہو جانے دیا۔ مرزا جی اور ذاکر کے نذرو کی طرف متوجہ ہو جانے سے اپ

وہ اُسے پریشان نہ کرتے تھے، اور وہ اپنے آپ کو کچھ ہلکا سا پاتا تھا۔ نذرو کی خبرگیری اور توجّہ سے اُس کے کام بغیر کسی تکلیف کے ہو جاتے تھے، اور اب اُسے اپنی کتابوں، اور رسالوں کے رومانی افسانوں میں وقت گزارنے کا پہلے سے بہت زیادہ موقع ملنے لگا تھا۔ اس لئے اُس نے نذرو اور اُس کے برتاؤ کو بغیر کوئی اہمیت دئے، یا بغیر کسی تشویش کے یوں ہی چلنے دیا، اور اپنے پہلے استعجاب کو تحلیل ہو جانے دیا۔

لیکن اُس کا استعجاب دوبارہ زندہ ہوا۔ وہ اس وقت جب مرزاجی اور ذاکر کی آمد و رفت بڑھنے کے بعد پھر گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ گئی تھی۔

اُس کے ملنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک تو اُس کے ساتھی، نویں کلاس کے کچھ لڑکے۔ یہ سب اُس سے کافی بڑے تھے، اور سب اپنے اپنے اُستروں کا انتخاب کر چکے تھے۔ یہ جمیل کی طرح دُبلے پتلے، کمزور اور منحنی نہ تھے، بلکہ اُن کی چوڑی ہڈیاں، اُٹھے ہوئے کندھے، ور بھرے ہوئے ڈنڈ تھے۔ یہ لوگ جب آتے تھے تو اُس سے الگ ہو کر بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ کبھی تو اُس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے، کبھی اُسے سینے سے لپٹا کر بھینچتے یہاں تک کہ اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا، اور اُس کی پسلیاں ٹوٹنے سی لگتیں، کوئی اُسے گود میں بٹھاتا، کوئی اُس کے سینے کی کھال کھینچ کھینچ کر لال کر دیتا، کوئی اُس کے بال بکھیر دیتا۔ اور پھر بھی ان لوگوں کی چمکتی ہوئی آنکھوں، پھڑکتے ہوئے نتھنوں اور پھیلے ہوئے ہونٹوں سے معلوم ہوتا کہ اُن کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ تھک کر بالکل چُور ہو جاتا، اُس کے دماغ سے ہر قسم کے خیالات غائب ہو جاتے اور وہ افسردگی سے چارپائی پر پڑا رہتا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا تھا کہ اُس کے گالوں پر ایسا لیس دار تھوک لپ جاتا کہ اُس کی کھال کھنچی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔ دو دو تین تین مرتبہ مُنہ دھونے کے بعد بھی اُسے محسوس ہوتا کہ یہ سنہا سمت اُس کے چہرے پر اُسی طرح نمایاں ہے، اور وہ غسلخانے سے نکل کر گھر والوں کی نظروں سے بچتا ہُوا سیدھا اپنے

کمرے میں چلا جاتا۔ اتنے لوگوں کو اپنا مدّاح پا کر اُسے ایک گونہ تسلّی تو ضرور ہوتی تھی، مگر اُسے اُن کی یہ حرکات عجیب مہمل اور لغو نظر آتی تھیں۔ ان کا مقصد اُس کے لئے مبہم اور مشکوک سا تھا، اور نہ اس کی متانت نے ان لوگوں کو ان حرکات کی غرض و غایت کو زیادہ واضح کرنے دیا تھا۔ جب وہ جاتے تو اُس کے لئے بس اتنا چھوڑ کر جاتے، تھکا ماندہ جسم، دُکھتی ہڈیاں، تپتے ہوئے گال، گرم کنپٹیاں، درد کرتا ہوا سر، اور چڑچڑا مزاج۔ اور پھر اُن سے بچنا بھی خوشگوار نتائج پیدا نہ کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اندر سے کہلوا دیا کرے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے، لیکن اُس نے خود دیکھا تھا کہ ایک مرتبہ شمس الدین نے شرط بد کر گھونسے سے کرسی کا تختہ توڑ دیا تھا۔ اور عنایت علی کے ہاتھ کی قوت تو خود اُس کی اُنگلیاں پنجہ لڑانے میں محسوس کر چکی تھیں۔

ملنے والوں کے دوسرے گروہ میں نچلی کلاسوں کے لڑکے تھے ۔۔۔ چھٹی سے لے کر آٹھویں تک۔ یہ سب جمیل کے ہم عُمر یا اس سے کچھ چھوٹے تھے۔ یہ لوگ پہلے گروہ کی غیر موجودگی میں آتے تھے، اور ان ہی میں جمیل کو زیادہ کُھل کر ہنسنے، بولنے اور تفریح کرنے کا موقع ملتا تھا۔ پھر ان پر اس کا رعب بھی خاصا تھا۔ اگر وہ کبھی ذرا ناراضگی کا اظہار کرتا تو سب کی ہنسی رُک جاتی تھی، اور وہ مجرمانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے تھے۔ تاہم وہ بڑی حد تک اُن کے مذاق کا بُرا بھی نہ مانتا تھا۔ بعض بعض دن تو جب وہ دوپہر کی گرمی اور خاموشی میں بےچینی سے اکیلا کروٹیں بدلتا ہوتا، اور کہیں ساتویں کلاس والا مظہر آنکلتا، تو اس کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگتا۔ اپنی قمیص کے دامن کو ہاتھوں سے ٹانگوں کے قریب تھامے ہوئے وہ مظہر کو کسی بہانے سے کونے کی طرف لے جاتا، اور اُس کا کندھا پکڑ کر ہچکچاتے ہوئے جلدی سے اس کے گال پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا اور پھر فوراً پیچھے ہٹا لیتا۔ گال ٹھنڈا، چکنا اور پھیکا سا ہوتا، مگر اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کی بےچینی یکلخت مدھم پڑ گئی ہے۔ اُسے اپنی یہ حرکت کچھ بےمعنی اور احمقانہ معلوم ہونے لگتی۔ وہ دل ہی دل میں حیرت سے ہنستا، پھر کچھ شرما کر بیٹھ جاتا، اور مظہر سے اُس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگتا۔

غرض اسی گروہ نے جمیل کو دوبارہ نذرو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں میں بھی نذرو کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ایک دن نذرو کی موجودگی میں، مشتاق نے مذاق اور قہقہوں اور چیخوں کے درمیان اپنی آواز کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "بھئی آج یہ طے کرو کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، مالک یا نوکر!" اپنے نوکر کو اس نئی روشنی میں دیکھے جانے کے خوف سے جمیل کی ناک کے دونوں طرف سُرخی جھلک آئی، اور اُسے اپنی کھال سکڑتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مگر اس نے اس ترکیب میں اپنی آخری اُمید سمجھتے ہوئے مسرور کو زور سے دھکا دیا۔ "ابے، میرے اُوپر گرا ہی پڑتا ہے!" اُسے توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مسرور کے دھکے سے میز گر پڑی، اور اس نے سب کو کتابیں چننے میں لگا دیا۔

اب جمیل کی آنکھیں زیادہ تجسّس اور رشک آمیز حیرت سے نذرو کے چہرے اور جسم کو ٹٹولا کرتی تھیں۔ مشتاق نے ایسا ذکر چھیڑ کر اس کے جذبۂ افتخار کو ایک بے پناہ ٹھیس لگا دی تھی۔ اُس نے اپنے دوستوں کے دوسرے گروہ سے بھی ملنا اب بہت کم کر دیا تھا کیونکہ اُسے اُن کے متفقہ فیصلے کا، جو ممکن تھا اُس کے خلاف ہوتا، بہت ڈر تھا۔ مگر وہ اس خیال کو اپنے دل سے کسی طرح دور نہ کر سکا۔ اسی لئے وہ اپنے خطروں کو دلیلوں سے دُور کرنے کی پیہم کوششیں کر رہا تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ نذرو کو غور سے دیکھتا، اور پھر کوشش کرتا کہ ایک نفرت آمیز "ہنہہ" کے ساتھ اس کی طرف سے نظریں پھیر لے۔ نذرو کی انگلیاں، وہ سوچا کرتا، کیسی موٹی موٹی گنواروں کی سی ہیں، اور اسی طرح اس کے بھدّے پیر، بغیر بالوں والی پنڈلیاں کیلے کے پیڑ جیسی ہیں، بیچ میں سے مڑا ہوا ہونٹ، ایک دانت آدھا ٹوٹا، اور کی گانٹھ جیسے کان، چھوٹی اور گھنی گردن، پھیلا ہوا پیٹ، گالوں میں ہنسی کے وقت گڑھے پڑ جاتے ہیں جیسے بازاری عورتوں کے ـــــ جمیل کو اس چیز سے کس قدر گھن آتی تھی ـــ شرابیوں کی سی چال، کندھے مٹکاتے ہوئے۔ اور ایک نفرت آمیز "ہنہہ"! لیکن اس "ہنہہ"

کے باوجود وہ اُسے دوسری دفعہ دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ اُس کے گندمی رنگ میں سفیدی کی چھینٹ ہے۔ آنکھوں کے نیچے ہڈیوں پر تو ذرا سی سُرخی بھی جھلکتی ہے؛ کھال تنی ہوئی ہے، مگر چکنی اور چمکدار! ٹھوڑی کیا گول ہے! چال کے لاّ اُبالیانہ پن میں نہ معلوم یہ ہلکی سی کشش کیوں ہے۔ آنکھیں گول مٹول سہی، مگر متجسّس، اور چمکتی ہوئی، اُس کی گردن پر ذرا میل نہیں جمتا۔ بازوؤں کی مچھلیاں کیسی حرکت کرتی ہیں، چہرہ گولائی لئے ہوتے ہے۔ جمیل خود اپنی رائے سے بھی خوفزدہ ہو جاتا، اور فوراً کوئی کتاب اُٹھا لیتا جو دس منٹ سے زیادہ اُس کی مدد نہ کر سکتی آستینیں اُوپر کھینچکر وہ اپنی بانہوں کو اُوپر سے نیچے تک دیکھتا، گندمی رنگ، پتلی پتلی، لکڑیاں سی، ہلکے ہلکے بال۔ کچھ مطمئن ہو کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا۔ ایک نرم ـــــ نہایت نرم، روئی کی طرح ـــــ اور چکنی سطح پر اُس کی اُنگلیاں پھسلتیں۔ یقین کو عین الیقین بنانے کے لئے وہ آئینہ اُٹھا لیتا۔ بڑی بڑی، سیاہ، بادامی لمبی پلکوں والی آنکھیں آئینے میں سے اُس کی طرف جھانکتیں۔ اُسے ایسی خوشی ہوتی گویا اُس نے کوئی نئی دریافت کی ہے۔ دودھ جیسے سفید اور بلند ماتھے پر سیاہ چمکدار بالوں کی، جن میں پیچھے کی طرف ہلکا سُنہرا رنگ جھلکتا تھا، کوئی لٹ پڑی ہوتی، زردی مائل سفید رنگ میں آنکھوں کے نیچے کافی دُور تک سیب کی سی سُرخی ملی ہوئی ہے، ناک لمبی سہی، مگر پتلے ہونٹ خاصا نعم البدل ہیں۔ کانوں کے لبان کو بال چھپا لیتے ہیں۔ ٹھوڑی چپٹی ہے . . . . ہے تو ہوا کرے، رنگ تو گورا ہے۔ چہرہ گول نہیں ہے . . . . . آنہہ . . . . . گول چہرے ہی میں کون سی خوبصورتی لگی ہوئی ہے۔ اُوپر کے ہونٹ پر ہلکے ہلکے بال نظر آنے لگے ہیں . . . . مگر ایسا رُواں تو جمیل نے کئی عورتوں کے بھی دیکھا تھا . . . . اپنی پتلی کمر کی بدولت وہ اپنے دُبلے پن کو بھی معاف کر سکتا تھا۔

یہ نظرئے اطمینان بخش تو ضرور تھے، مگر موازنے کا خیال جمیل کے سامنے ایک ایسے گھناؤنے عفریت کی شکل میں آتا تھا جو اپنی زہرناک حاسدانہ نظروں سے ناک اور کانوں کو کھینچ کھینچکر دُگنا لمبا کر دیتا، ٹھوڑی کو پھیلاتے پھیلاتے دہلیز بنا دیتا۔ چہرے کو ہر طرف سے

پیٹ پیٹ کر کانیں نکال دیتا، اس کے رنگ کو ہلدی کی طرح دکھلاتا اور اس سیب کی سی سُرخی کو دھندلا دیتا۔۔۔ اوپر کے ہونٹ کے ہلکے ہلکے بال گہرے اور گھنے ہونے شروع ہو جاتے، اور جمیل پیچ و تاب سے تنگ آکر انہیں ناخونوں سے کھینچنے لگتا۔

. . . .

مگر نذرو کا طرزِ عمل بدل رہا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ اُس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اب، وہ اُس کا کہنا ماننے سے انکار نہ کرتا تھا؛ اور کم سے کم جمیل کے پڑھتے وقت وہ بالکل نہ گاتا تھا، بلکہ اب تو اس کی غزلوں کا انتخاب بھی اصلاح پذیر تھا؛ اور اس کا دل پسند گانا اب یہ تھا: "کرے گا کیا ارے صیاد تو جنجیر کے ٹکڑے"! اب وہ جمیل کے کمرے کی طرف زیادہ رہنے لگا تھا۔ جمیل پڑھتا رہتا؛ اور وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھا اپنا سر یا بازو کھجایا کرتا؛ اور بعض وقت تو اُونگھنے بھی لگتا۔ نہ معلوم اُسے کیا سما گئی تھی کہ وہ اپنی عمر جمیل سے کم ثابت کرنے کے لئے بہت بیقرار رہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ جمیل کو پڑھنے سے روک کر کہتا: "ذرا حساب تو لگانا جمیل میاں، کہ میں کتنے برس کا ہوا۔۔۔۔ جب میں پڑھنے بیٹھا ہوں تو آٹھ سال کا تھا میں۔۔۔۔ تو آٹھ۔۔۔ اور دو دس۔۔۔ اور پانچ۔۔۔ پندرہ۔ چھوٹا ہی ہوا نہ میں تم سے؟"

جمیل چڑ سا جاتا؛ اُسے محسوس ہوتا کہ نذرو اپنی برتری جتانا چاہتا ہے۔ ایک دوسری چیز بھی جمیل کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔ جب وہ اپنی کتاب میں غرق بیٹھا ہوتا، تو نذرو اُسکے پیروں میں گدگدی کئے بغیر کبھی نہ مانتا، حالانکہ اُس کے بدلے میں اُسے لاتیں اور چانٹے کھانے پڑتے تھے۔ نذرو کی ایک اور عادت یہ تھی کہ وہ جمیل کے سرہانے بیٹھ جاتا، اور اس کے بالوں میں ہلکے ہلکے انگلیاں پھرایا کرتا۔ اس سے جمیل کے تھکے ہوئے اور خشک دماغ میں ایسا معلوم ہوتا گویا سکون اُترتا چلا جا رہا ہے، اور وہ گردن کو ڈھیلا چھوڑ کر کتاب سے توجہ ہٹا لیتا۔ شروع شروع میں تو اس نے نذرو کو بھگا بھگا دیا، مگر جب وہ کسی طرح باز نہ آیا، تو آخر اُس نے نذرو کو یہاں تک اجازت دیدی کہ وہ کنگھا لیکر بیٹھ جائے اور جس طرح چاہے اُسکے بال بنائے،

اور پھر بگاڑے، اور پھر بناتے اور پھر بگاڑے......

اخیر اکتوبر کی رات کے ۹ بجے تھے، کچھ خنکی سی ہو رہی تھی جمیل کوٹھے پر دالان میں اکیلا لیٹا تھا۔ نذرو آیا، اور اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا، "جمیل میاں ایک بات کہوں تم سے۔ بُرا تو نہیں مانوگے؟"

جمیل دَھک سے رہ گیا۔ اُس کے دل کی حرکت رُکتی سی معلوم ہوئی، اور ٹانگیں سنسنانے لگیں۔ کئی دن سے نذرو کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی بات کہنی چاہتا ہے جمیل کو شُبہ تھا کہ وہ بات غیر معمولی ضرور ہے۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ایسی بات سننے سے جس کی نوعیت سے وہ بالکل بےخبر ہے، انکار کر دیگا۔ لیکن اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ آخر کچھ سوچکر اُس نے رُکتے ہوئے کہا "ہاں، کہو" نذرو نے بات کہنے کا انداز بنانا شروع کیا ہی تھا کہ قدموں کی آواز آئی۔

یہ بات کئی دفعہ قدموں کی آواز سے مُلتوی ہو ہو گئی۔ لیکن آخر ایک دن ایسا آیا کہ نذرو نے نہ صرف بات کہنے کا انداز بنالیا، بلکہ بات بھی شروع کر دی اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ اُس نے پُراسرار آواز میں مُسکراتے ہوئے کہا "اجی کیا بتاؤں میں نے کیسا عجیب خواب دیکھا... عجیب خواب تھا سالا... کیا بتاؤں، جمیل میاں، کیسا خواب تھا وہ"

"ہاں، کیا خواب تھا وہ؟" جمیل نے بیتابی، مگر شُبہ سے پوچھا۔

"اجی، کیا بتاؤں.... کیا خواب تھا وہ .... میں جب سے وِسی کو سوچ رہا ہوں برابر"

"ابے تو کچھ کہیے گا بھی"

"ہاں، ہاں، توجی، وہ خواب .... بُرا تو نہیں مانوگے جمیل میاں"

"تو کہہ تو کسی طرح"

لمبا سانس لیکر نذرو نے سُنایا "بُرا مت ماننا، جمیل میاں، دیکھو.... وہ خواب... ہنسی آوے ہے مجھے اُس خواب پہ ......"

جمیل نے پھر ڈانٹا۔

"ہاں تو میں نے یہ دیکھا خواب میں، جمیل میاں، کہ.... کہ.... میں اور تم ایک پلنگ پہ لیٹے ہیں۔"

بم کا گولہ پھٹا۔ مگر چونکہ جمیل نے اسی نوعیت کی کوئی بات سننے کے لئے اپنے آپکو پہلے سے تیار کر لیا تھا، اس لئے اس دھکے کا مقابلہ کرنے میں اس کی کوشش زیادہ کامیاب رہی اس سب کو وہیں ختم کر دینے کے لئے جمیل نے اس لفظ کو انتخاب کیا: "اچھا!" اور اس لفظ کو اس نے ایسی آواز میں ادا کرنے کی کوشش کی جس میں کسی جذبے کی آمیزش نہ ہو۔

نیچے سے کسی نے نذرو کو پکار کر جمیل کی مدد کی۔ اس نے جانے کے لئے اٹھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں آنکھیں گھما کر کہا: "جمیل میاں، ویسے جتنا چاہے دِق کر لو، خواب میں تو مت تنگ کیا کرو۔"

اب جمیل نذرو کی نگاہوں سے کچھ سہما سا رہنے لگا۔ نذرو نے بھی اس کے کمرے میں آنا بہت کم کر دیا تھا۔ لیکن وہ اکثر جمیل کے سامنے مسکرا پڑتا تھا۔ جب سے جمیل شرمندہ سا ہو جاتا، گویا وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ جب تک نذرو اس کے کمرے میں رہتا اسے سوئیاں سی چبھتی معلوم ہوتیں، اور اس کا دل چاہتا کہ چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو نذرو کی نگاہوں سے بچا لے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ بیٹھے لیٹے وہ کسی چیز کو اپنے پیروں کے قریب محسوس کرتا۔ کتاب سامنے سے ہٹا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ نذرو اسکے پیر سے اپنا چہرہ لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نفرت اور غصے سے پیر کھینچ لیتا۔ مگر اب وہ نذرو کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کے خوف سے اسکے لات نہ مارتا تھا۔ اب چاہے اس کے سر میں درد ہی کیوں نہ ہو، وہ کبھی نذرو سے سر ملنے کو نہیں کہتا تھا اور اسکے بالوں سے نذرو کی دلچسپی بھی جیسے زائل سی ہو گئی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ سب معمول سا ہو گیا، اور جمیل نے نذرو کی حدود دیر خیال کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن ایک واقعہ سے اس کی جھینپ اور ڈر، جو اب کم ہو چلے تھے، نفرت اور کراہیت میں

تبدیل ہوگئے۔ پہلی مرتبہ قوّالی سننے کا شوق جمیل کو عُرس میں لے گیا، اور رات کے خیال سے نذرو بھی اُس کے ساتھ کر دیا گیا۔ جگہ تو خیر بیچ میں مل گئی، مگر کچھ پیچ اتنی تھی کہ کروٹ بدلنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ تالیوں اور ڈھول کے گھٹا کے قوالوں کی منجھی ہوئی بے روک آوازوں کے ساتھ ملکر اپنا کام کر چکے تھے۔ ایک گیروالباس اور لمبی ڈاڑھی اور بالوں والے صاحب نے اپنی وارفتگی کا اظہار، آنکھیں بند کر کے جھونٹے کھانے سے بڑھ کر، اپنے مسلک کی روایتی خوش ادائی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے لئے میدان خالی کر دیا گیا، اور "جہاں پیدا ہوا شیر خدا معلوم ہوتا ہے" کی تکرار ہونے لگی۔ اُن کی ہر فلک شگاف "اللہ ہو" پر اُن کے سر کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھکر، نذرو "اجی! اجی!" کہہ کر پیچھے ہٹتا جاتا تھا، اور جمیل کے اُوپر گرا پڑ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے جمیل کا بازو کھینچ کھینچکر کہہ رہا تھا: "اجی جمیل میاں، مجھے تو ڈر لگے ہے" لوگ ہنسنے لگے۔ جمیل کے کان سُرخ اور گرم ہو گئے، اور اُس کی کنپٹیاں جل اُٹھیں۔ اُس دن سے جمیل کی جھجک نکل گئی، اور وہ اب نذرو کی نگاہوں کا بے خوف ہو کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب اُس نے نذرو کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے اُس کالے پیلے مینڈک کو جو برسات میں نالیوں پر سے رینگتا ہوا بستر کی سفید چادر پر آ چڑھے۔

اپریل آگیا ــــ گنگا اور جمنا کے دوآبے کا بے رنگ اور افسردہ اپریل۔ موسم کی خشکی، گرمی، ہوا، خاک، دُھول، سالانہ امتحان کی تیاریاں، مایوسیوں اور اُمیدوں نے اضمحلال اور گُم گشتگی کی ایک مستقل فضا پیدا کر دی تھی ــــ رُوح پر ایک ناقابلِ برداشت لیکن لازمی بوجھ کی طرح۔ دوپہر کا وقت تھا، ہوا کمرے کے کواڑوں کو ہلائے ڈالتی تھی، اور گرد نے روشندانوں میں سے آ کر چہرے اور بالوں کو بھورا بنا دیا تھا۔ باہر تو دُھوپ کا جو کچھ بھی حال ہو، مگر کمرے میں جہاں جمیل لیٹا تھا، گرمی کا اس قدر اثر ضرور تھا کہ اُس نے جسم کو تھکا ہوا اور دماغ کو گُٹھل بنا دیا تھا۔ باوجود درختوں کے ہلنے کے، ایک پُر رمز اور گراں بار خاموشی مسلط معلوم ہوتی تھی، جس میں دُور سے کسی خوانچے والے کی آواز وحشت کا اضافہ کر دیتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ایک

جان کاہ ہتھوڑے کی طرح کانوں کے پردے پر پڑ رہی تھی؛ اور ہر گھڑی کی جھنجھناہٹ تیز لمبی سلاخوں کی طرح دماغ میں گھس کر آہستہ آہستہ بے حس کر چکی تھی۔ جمائیاں ٹوٹی پڑتی تھیں، اور آنکھوں سے پانی ڈھلکنے لگا تھا۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلنے اور سر کے بال نوچنے پر بھی نیند نہ آ رہی تھی۔ کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا گویا موسم کی شدتوں نے ہر چیز کو برباد کر دیا ہے، خاتمہ کر دیا ہے —— سکون کا بھی اور نیند کا بھی۔ ٹانگیں جکڑی ہوئی تھیں، اور رانوں میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جمیل خاموش سیدھا لیٹ جاتا، ہاتھ پھیلا کر اوپر کی طرف اور ٹانگیں اکڑا کر نیچے کی طرف کھینچتا، اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ وہ رانوں کو مٹھیوں سے پکڑ کر خوب رگڑتا، گویا وہ انہیں گھس کر ختم کر دینے پر تلا ہوا ہے۔ جب اس سے بھی سکون نہ آتا تو وہ گھٹنے چھاتی پر اور بازو آنکھوں پر رکھ کر خاموش لیٹ جاتا۔۔۔ تھوڑی دیر سے نذیر بڑی دلچسپی سے اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ پاس کی طرف آیا، اور ایک منٹ تک آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا، اور کھڑکھڑاتی ہنسی ہنس کر کہنے لگا: "جمیل میاں، تمہارے پاس بیٹھ جاؤں؟"

جمیل کے پیروں میں سے خون بھاگا اور رانوں میں سنسنی پھیلاتا ہوا، تیزی سے دماغ میں جا کر کھوپڑی سے کھٹ سے ٹکرایا۔ دل دھڑ دھڑ چلنے لگا۔ کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں اور درد کرنے لگیں —— معلوم ہوتا تھا اس کے جسم کی ہر ہر رگ بغاوت پر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خون کے دوران نے اس کی سوچنے کی قوتوں کو معطل کر دیا تھا۔ وہ "ہاں" کہنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے پکارا: "جمیل!"

امتحان کے اندیشوں اور دھندوں کی جگہ اب چھٹیوں کی بے فکری اور بے خیالی نے لے لی۔ گرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ گرمی اب بھی پڑتی تھی، ہوا اب اور تیز ہو گئی تھی، مگر نئے موسم کا کسل اور بیگانگی ختم ہو چکی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ کسی چیز کے اس کی ٹانگ کے قریب حرکت کرنے سے جمیل کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چھت پر سو رہا تھا۔ چاند آسمان پر ٹھیک بیچ میں تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی جس

کے دوسرے کونے سے خالو کے تیز خراٹوں کی متواتر آواز آ رہی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر اُسے تعجب ہوا کہ نذرو کا پلنگ جو شام دُور بچھا تھا، اب اُس سے ایک گز کے فاصلے پر آ گیا ہے۔ اُس نے اپنے پلنگ پر ہر طرف ٹٹولا، مگر کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ اُس نے پھر چادر سے مُنہ ڈھک لیا۔ تھوڑی دیر خاموش لیٹے رہنے سے اُسے پسینہ آتا معلوم ہُوا۔ اور اُس نے چادر کو سینے تک کھینچ لیا۔ نیند ایک دفعہ اُچٹی تو بس پھر غائب ہی ہو گئی۔ کچھ دیر تو وہ چاند کو آسمان پر کھسکتے ہوئے دیکھتا رہا، اور پھر اُس سے اُکتا کر خالو کے خراٹوں پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ کیسی آواز نکل رہی ہے، اُس نے سوچا، جیسے بلّیاں لڑ رہی ہوں ـــــ یہ تشبیہ اُس نے اپنی خالہ سے سیکھی تھی۔ دفعتاً اُسے نذرو کی آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔

"ابے جاگ رہا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

گاڑھے کی موٹی چادر میں سے نکلے ہوئے مُنہ نے جواب دیا: "ہاں"

"یہاں کیسے آ گیا بے تو؟" کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے جمیل نے پوچھ لیا۔

"تو کچھ ہرج ہے؟"

جمیل نے اتنی رات گئے اس کا جواب چانٹے سے دینا مناسب خیال نہ کیا، مگر یہ جواب گفتگو کو آگے بڑھانے میں بھی مددگار نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش لیٹے اپنی پلکیں جھپکاتے رہے۔

نذرو کا ہاتھ اور سینہ بھی چادر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے کہا: "اجی، کیا چاندنی ہو رہی ہے"

"ہوں" جمیل نے جواب دیا۔ مگر چاہتا وہ بھی تھا کہ اگر نیند نہیں آتی تو کم سے کم باتیں کر کے ہی وقت ٹالا جائے۔

"بڑی سیریں کی ہیں ہم نے بھی دلّی میں چاندنی میں"

جمیل نے ایسا موضوع تلاش کرنے کی کوشش میں جس پر کچھ دیر تک باتیں ہو سکیں، ہمیشہ سے زیادہ بے تکلفی سے کہا: "بڑی بدمعاشیاں کی ہوں گی، سالے، تم نے دلّی میں"

"اجی ہم نے؟" نذرو ہنسا "اجی ہاں ..... نہیں ..... تمہیں تو جمیل میاں، کچھ شوق ہی نہیں۔"

"ائے، مجھے شوق! کس بات کا؟"

"یہی سیر و پر، دنگل۔" نذرو اپنی کہنی کے سہارے اُٹھا۔ اور اُس کا ہاتھ جمیل کے پلنگ کی پٹّی پر آگیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا "لاؤ ٹانگیں دبا دوں جمیل میاں۔"

"کیوں، کیا میں کوئی تھکا ہوا ہوں؟"

نذرو کا ہاتھ اُس کی ٹانگ کے قریب آگیا۔ "نا ویسے ہی۔"

"ہونہہ!" جمیل نے جھینپتے ہوئے کہا۔ لیکن جب نذرو کا ہاتھ اُس کی ران پر پہونچ گیا تو اُس نے کوئی اعتراض کیا بھی نہیں، اور چُپ لیٹا رہا۔

ہاتھ ران پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جمیل کی ٹانگوں پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی معلوم ہوئیں، اور نذرو کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ اُس کا خون بھی چلنے لگا۔ جب انگلیاں زیادہ سریع الحس حصّوں پر پہونچیں تو اُس کے گدگدی ہونے لگی، اور اُس نے نذرو کا ہاتھ جھٹکے سے پکڑ کر، بغیر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "ائے" کہا۔ مگر ہاتھ اُسی طرح چلتا رہا۔

خالو کے خرّاٹے رُک گئے، ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

پھر وہی خر، خر، خر، خر۔ ران پھر سہلائی جانے لگی۔

یکلخت نذرو نے ہاتھ کھینچ لیا، اور چادر سے اپنے جسم کو کندھوں تک ڈھک کر سیدھا لیٹ گیا۔ اُس کا بدن تیر کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے، اور پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ اگر جمیل اس کا چہرہ چھو کر دیکھتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ وہ کتنا گرم ہے۔

"ائے یہ کیا؟"

"اجی تم کیا جانو تم نے کیا کر دیا!" نذرو نے رُکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

جمیل حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد نذرو پھر سیدھا ہوا، اب اُسکے

چہرے سے ایسا سکون معلوم ہوتا تھا گویا کوئی طوفان چڑھ کر اُتر گیا ہو۔

جمیل کی ران پھر سہلائی جانے لگی... جمیل کے بدن میں کھلبلی سی ہوئی، سارا جسم پُھنکنے لگا۔ سر چکرا سا گیا۔ اُسے ایک پھریری سی آئی، اور وہ نذرو کا ہاتھ الگ پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے جلدی سے نالی پر جا کر پیشاب کیا۔ پانی پی کر اُس نے تھوکا، اور اب سونے کے ارادے سے چادر تان کر لیٹ گیا۔ خالو کے خراٹوں سے اُس پر جلدی ہی غنودگی طاری ہو گئی۔

اُس کی ٹانگ پر کوئی چیز ہلی۔ اُس نے چادر سے سر نکال کر دیکھا، نذرو کا ہاتھ تھا۔ نذرو اپنے پلنگ پر سے آگے کو جھکا ہوا تھا، اور اُسکی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔

نذرو نے کہا "آجاؤں؟"

جمیل کے پیٹ میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا جو بجلی کی سرعت سے تمام جسم میں پھیل گیا؛ اُس کا سر گھوما، آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی، اور سائبان کے کھمبے اور اُن کے لمبے سائے ناچتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اُس کے رُکے ہوئے حلق میں سے پھلتے ہوئے صرف دو لفظ نکل سکے۔

"اَلے ہٹ!"

"نیا ادب" اپریل ۱۹۴۱ء

۱۹ فروری ۱۹۴۰ء

حرام جادی

دروازے کی دھڑ دھڑ اور "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اُس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پُرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں، لیکن دوسرے لمحے ہی مُنہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اُجالے میں ملی ہوئی سُرمہ جیسی سیاہی اُس کے پپوٹوں پر بھرنے لگی، اور وہ پھر بند ہوگئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈیلوں کو دبا کر سُلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر جھنجھنا رہے تھے، وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے ـــــ اور پھر بھی وہ جھنجھنا رہے تھے۔

اُمید و بیم کی یہ کشمکش، جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دامن میں جذب کر لیتی، زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازے کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور کھڑکھڑاتے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں ـــــ "کھولو ـــــ کھولو۔" یہ آوازیں پتلی، نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گُھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کیے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سُن رہی تھی کہ پکارنے والا "کھولو" "کھولو" کے وقفوں کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا، یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اُسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا..... آخر اس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں، اور ہاتھوں کو

چارپائی پر جھکتے ہوئے کہا "نصیبن، دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اُس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے وہ اس قصبے میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا ——— یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش، یہی جھلاہٹ اور پسپائی ——— سب اسی طرح۔ اُسے صبح ہی اُٹھ کر جانا پڑتا تھا، اور پھر اُس کا سارا دن نوواردوں کو اچھا جانا، چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن کے آئے ہوؤں کی رفتارِ ترقی کے معائنے میں، اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزرتا تھا۔ اُسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں صبح و شام کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے ——— ہر گھنٹہ، ہر گھڑی اُسے کرو ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر۔ ضبطِ تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے، اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۶۵ سالہ بڑھے، الھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تندہی اور یکجہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے، گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں۔ اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا، وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرض کہ بچے چلے آ رہے تھے: کالے بچے، پیلے بچے، [illegible] مرغ کی طرح سُرخ بچے، اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچہ، یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے

سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

اُملی نے اپنی دادی سے سُنا تھا کہ اُن کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ـــــ اور اس وقت اُسے بے ساختہ ہنسی بھی آجاتی تھی ـــــ کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں ـــــ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک!

اور اُسے ان ہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرے کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ تاریک، سیلی ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے کتّوں، اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھنسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا، اور کچھ نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصّہ غصب کئے رکھتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سماٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے اَملی کو ہلکے پھلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اُونچی ایڑی والا کالا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے اُبھرے ہوئے لاتعداد کنکر اُس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستے میں گلّی ڈنڈا اور کبڈّی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اُس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر یہ شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی۔ اور یہاں کی گرمی! اُسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھُل گھُل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اُس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں، اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اُونچی ایڑیوں پر، لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دُھوپ میں جلتی بھُنتی، سڑکوں پر سے گزرتی تو اُسے دور آلہا گانے کی آواز، ڈھولوں کی کھٹ کھٹ اور درختوں کی

نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح، بیزار کن اور پُراستہزا معلوم ہوتے، اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا جسے صبح اُٹھکر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا، اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کیے رکھتا تھا۔ اُسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ـــــ ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی ـــــ کچھ ہریالی اُس کے سامنے تیرتی .... اور وہ پھر اُسی تپتی ہوئی کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصوّر تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اُس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں، جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی، اور اُسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا، تو اُس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سینما کے پردے کی طرح پوری روشنی اور صفائی کے ساتھ، اس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگتیں، اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اُٹھانے کے درمیان، اُن مناظر کو یاد کرتی جن سے اُسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا، تو اُس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عُود کر آتی، گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اُس پر جُھک پڑتیں، دل بھنچنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا، اور اس کا سر گھُمتی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا۔ اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اُسی پُرانے شہر کے اسپتال میں پہونچ گئی ہے، مگر اُن در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے، اور خود اُس کے اعضا منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں، اور کوئی نامعلوم خوف اُس کے دل پر مسلّط ہے۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی، اور دراصل اس کے لیے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہیے تھا ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا۔ مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی سیلی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار، شریر لڑکے موجود تھے، اور وہ اُن کے وجود سے بے خبر بھی نہ تھی، لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پروا

اور مطمئن، تانگے کے گدّوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی، اُس کی دُنیا تو اِن علاقوں سے دُور ضلع کے صدر اسپتال میں تھی کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ؛ اور وہاں کی ہوا کا لطف تو وہ ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کے سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ شام کو اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اُس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اُس کی ساڑھی پھڑپھڑانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ تیرتی، اور اُس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پُرلطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکّڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرے میں دوپہر کی سختی اور اُداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ تیز رفتار انداز سے ساڑھی کا پلّو سنبھالے گزرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اُسے "میم صاحب، میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اُسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے، سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اُسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے، بلکہ قصبے کے زمیندار تک اُسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی؛ وہ رعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اُس کی شخصیت سپتال کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اُس سفید، سرد، اور متین عمارت اور اُس کے غیر مرئی مگر اٹل قوانین اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا، اسی طرح اس کے حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اُس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اُس کا مریضوں کے معائنے کا وقت آتا تھا، تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں؛ وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی

کیونکہ اُسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی، اور ہمیشہ سب سے "تم" کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی مُنہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں، مگر اُسے دو بدو جواب دینے سے نہ چُوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک اُن پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی، اور اُن کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی۔ اور صفائی اور سلیقے کی تو اِن عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ زچّہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چاول اور دوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کوئلوں کا گھڑا، سونٹ اور رُوئی کی گٹھڑیاں، سب اللّم غلّم بھرے ہوتے تھے، اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرے میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی، اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ـــــ اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں ـــــ اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں، اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا اُلٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر، کھڑ بڑ، کراہوں، "یا اللہ"، "یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچّے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو امّاں کے قریب نہ پا کر چیخنا چلّانا شروع کر دیتے تھے۔ اور اُن کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں: "ارے، چُپ، چُپ .... دیکھو بھیّا آیا ہے .... صبح کو دیکھیو .... منّا سا بھیّا۔" مگر صبح کو منّا سا بھیّا دیکھ سکنے کی اُمید انہیں اس وقت کوئی تسکین نہ دے سکتی، اور اُن کی رُوں رُوں دھاڑوں کی شکل میں بلند ہو کر کمرے کے خلفشار میں اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں، لیپ چڑھے ہوئے تکیوں، پسینے میں

سڑے ہوئے کپڑوں، اور مدّتوں سے نہ دُھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے، جسے گرمی اور بھی دوآتشہ کر دیتی تھی، اُس کا جی اُلٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرے میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جہنّم کے عذابوں کے لیے تیاری کرنا تھا۔ یہ مانا کہ خود اُسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبے کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے، اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے، جو اَن دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلّح تھی، ہاتھوں میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں؛ انہیں تو قصبے کی پرانی دائی اور ٹوٹے پھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا۔ تاہم اُن کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مِڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اُس کا کام بالکل کم ہو گیا تھا، لیکن آخر ذمّہ داری تو اُس کی ہی تھی، اور وہ ہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر بھلائی بُرائی کے لئے جواب دہ تھی۔ اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر نوگرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتی اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا، یا پھر بعض ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت تک نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی زیادہ آفت تھیں، وہ اپنے تجربوں کے سامنے اِس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی ترک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں اور آئیلی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا۔ اور دائی تو بھلا اُس کی کہاں سننے والی تھی۔ اُسے اپنی برتری اور مِڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی، مگر اُس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اُس نے آئیلی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو آئیلی نے اُس کے طنزیہ جملوں کو پی جانے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری

عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں، اُس کی طرف توجہ کئے بغیر وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں، اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا جھنجلا کر پیر پٹخے، اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اُسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اُسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں، اور اُن کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں اُن کی چھوٹی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے، اور وہ اُس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے "کہو میم صاحب، لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے اِن گھنے، سخت، کالے بالوں کی قربت اُسے ہراساں کر دیتی، اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکا یک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرہ سے آملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی، اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہونچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر بھنّایا ہوا ہو، جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اُچھال دیتی، اور کپڑے اس طرح جھنجلا جھنجلا کر اُتارتی کہ دوسرے دن لفٹیننٹ کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ اُلٹا سیدھا کھانا حلق کے نیچے اُتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکئے پر سر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دُنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے، بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا، سر تکیئے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اُسے اُوپر اُچھالتا معلوم ہوتا، بازو شل ہو جاتے، ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اُوپر نہ اُٹھ سکتے؛ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں، اور کمر تو بالکل پتھر ہی بن جاتی۔ وہ اپنے پُرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی،

مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی ـــ کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی، سخت مونچھیں، یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے۔ وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک ٹکرہ جوڑنا چاہتی، مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی، بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اُس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا؛ نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیے والی نالی بہنے لگتی، اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مُسکراتے اور گھنے، سخت بالوں والی مونچھیں بیتابی سے ہلتیں... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، ٹکراتی، روندتی دوڑتیں..... سیاہ آسمان پہ روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے جگنوؤں کی طرح آنکھوں میں گھُس گھُس کر ناچنے لگتے، اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور جھمجھم سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں..... سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلّط ہو جانا چاہتے؛ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہونچتا اور پہلے والے کو دھکے دے دے کر باہر نکال دیتا؛ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی حریف نہ زور آزمائیاں اُسے بار بار چونکا دیتیں، اور درد بھری سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے.... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی، اور میلی نیند میں بالکل بے ہوش ہو جاتی..... مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اُس کے دماغ میں گونجتیں ـــ وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی

جھلاہٹ اور پسپائی۔

نفیسین باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اُسے شیخ صفدر علی کے یہاں بلایا گیا تھا، اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا، "جلدی"۔۔۔ "بلایا ہے ۔۔۔ جلدی ۔۔۔ ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے ۔۔۔ جلدی۔ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ اُن کی نوکر ہے، یا وہ اُسے کوئی دولت بخش دیتے ہیں؟ ۔۔۔ ہُنہہ ۔۔۔ جلدی! وہ نہ پہونچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اُسے بلا کر؟ ۔۔۔ کہتی ہیں چڑیلیں، "اُسے کیا خاک آتا ہے"۔۔۔ کیا خاک آتا ہے ۔۔۔ کچھ نہیں آتا ۔۔۔ اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر، کون کی خوشامد کرنے جاتا ہے ۔۔۔ کچھ نہیں آتا! ۔۔۔ جیسے جیسے آلے اُس نے دیکھے ہیں اِن لوگوں کے تو خواب میں بھی نہ گزرے ہوں گے ۔۔۔ چمک دار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے ۔۔۔ اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر، وہ کیسے نقشے دِکھا دِکھا کر جسم کے حصّوں کو سمجھاتی تھیں ۔۔۔ کچھ نہیں آتا ۔۔۔ ہونہہ!

اُمّی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کہلوا دے "وہ جلدی نہیں آسکتی، وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں، اُن کے بکنے سے اس کا بگڑتا کیا ہے، اور آخر ذمّہ داری تو خود اُس کی ہی ہے چنانچہ اُس نے نفیسین سے کہا، "کہہ دو کہ چلو، میں آرہی ہوں"۔ مطمئن ہو کر اُس نے کروٹ لے لی، سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اُس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے، اور ساکت ہو جائے۔ مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آکر لگتا تھا ۔۔۔ "جلدی" ۔۔۔ جب سے اُس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں، اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔۔۔۔ اُسے جلدی جانا تھا ۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔ اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی

تھی ـــــ جلدی جانا تھا..... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کرسکتی تھی، کل رات ہی اُسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ـــــ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جا رہی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہوگئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اُٹھ جانا بہت مضر ہوگا؛ اور خصوصاً اس قصبے جیسی آب ہوا میں جہاں اُس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر مہینے میں اُسے چار دن بخار آچکا تھا ـــــ اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی، اُن لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اسکی ـــــ تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی، اور اُس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اُس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا، اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کرلیں اب اُسے جھپکیاں آنا شروع ہوگئیں؛ مگر ہر دفعہ "دُودھ لو دُودھ!" "اے او کلو ہوتے!" "آٹھ! ہٹھ! اے پڑھنے نہ جانے کا؟" کی صداؤں، اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں ٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی ـــــ سونے کی کوشش کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا، سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی؛ اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اُس کے اعضا اور بھی زیادہ بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہوگئے اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ـــــ "جلدی بلایا ہے" ـــــ اس صبح کے چاندنے، اس قصبے پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اُس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ـــــ "جلدی بلایا ہے" ـــــ اس صبح کے چاندنے، اس قصبے، سب سے چھپا لے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہونچ نہ ہو؛ جہاں وہ ان سب سے ـــــ اپنے آپ سے غافل ہو جاتے ـــــ اپنے کو کھو دے...... اُسے محسوس ہوا کہ دو مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اُس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں.... سر کے درد کو گویا کسی نے یکایک پکڑ لیا.... دو آنکھیں بھی ذرا کچھ دور چمکیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور

اُس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا...... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا، سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پہ بہا چلا جا رہا تھا، سکون تھا، خاموشی تھی، اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی.... وہ بازو اُس کے جسم کو بھینچ رہے تھے.....
وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو......

اُس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاند نے اپنی چمک کھو دی تھی، نصیبن نے چولھے پر دیگچی رکھی، بکری والا محلے سے جانے کے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا، اور کنوئیں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں..... وہ بادامی سائے اُترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے، اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں گویا وہ ان سایوں کو پھانس لینا چاہتی ہیں..... سائے کچھ دور پر رک گئے۔ وہ ڈگمگائے، اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے..... آنکھیں صبح کے بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے — وہ مدت کے آشنا بازو — مگر وہ یہاں کہاں۔

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمین کو یاد کرنے لگی: لمبے لمبے پیچھے اُلٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی ڈاڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈیاں، اور مضبوط بازو..... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اُس کے بازو اُسے بھینچتے تھے، اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی۔ اور بعض دفعہ تو جھنجلا پڑتی تھی، مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا.... اور اُس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے.... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ.... اُس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی، مگر وہ کیسے جوش سے اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیتا تھا اور پاگلوں کی طرح اُس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا۔

اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا ..... "میری جان .... ہاہاہا ..... اسے می لی .... ڈی یر.... پیاری .... ہاہاہاہا" ــــــ اور وہ اُس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اُس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا، "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟ .... ہیں؟ .... اس سینے پر تو سُرخ کھلے گی! کہو، کیسی رہی؟ ہاہاہاہا" ــــــ اور وہ اُسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اُسے ایسے وقت اسپتال سے بُلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمسن سو رہی ہیں ــــــ وہ اُس کے اُٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا ــــــ اور وہ اُسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ــــــ مگر وہ یہاں کہاں! ــــــ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اُسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ــــــ لیکن وہ یہاں ہوتا؟ ــــــ وہ اسکے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ــــــ کچھ دوسری شکلیں اُبھریں ــــــ اچھا ہی ہے کہ وہ اُس کے پاس نہیں ہے ــــــ اُس کے بال اُلجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا اُن کا قیمہ کر کے رکھ دیگا ــــــ اور اُس نے اُسے کیسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا، "لے، اور لے گی .... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ ...." ــــــ اگر میم صاحب شور سُن کر نہ آجاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا ــــــ ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ــــــ ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا ــــــ کیسی خونی آنکھیں تھیں ــــــ اور آخر میں وہ شراب کتنی پینے لگا تھا ــــــ مگر وہ ہوتا تو اُسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ــــــ مانا کہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر تک ٹہلتا رہتا تھا لیکن ظاہرا تو اُس کے ساتھ اُس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا۔ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی، اور اُسے ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی ــــــ وہ اُسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ــــــ لیکن وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ روزا کے ساتھ پھرا کرے ــــــ روزا ــــــ کالا کوا سی

مُنہ پہ ہڈیاں نکلی ہوئی. سوکھی جیسے لکڑی ہو ـــــ اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو۔ بڑی میم صاحب بنتی تھیں. چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پہ قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے ـــــ نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی اُس میں جو وہ اس پر ایسا لٹّو ہوگیا تھا ـــــ اُس نے خواہ مخواہ فکر کی. وہ خود اُسے تھک کر چھوڑ دیتا ـــــ وہ اُسے تھوڑے دن یوں ہی چلنے دیتی تو کیا تھا ـــــ مگر اُس نے کیسی بے رحمی سے اُسے مارا تھا ـــــ ہاں ـــــ ایک دفعہ مار ہی لیا، تو کیا ہوگیا. وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا، اور اُس کے سامنے نہ آتا تھا ـــــ اور اگر ڈینا اُسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی. بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اُسے اُکساتی رہی ـــــ یہ اچھی دوستی ہے ـــــ اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی. اگر وہ ملے گی بھی تو وہ مُنہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی. اور جو ڈینا خود اُس سے بولی تو وہ صاف کہہ دیگی کہ وہ دھوکہ دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ـــــ ڈینا بگڑ جاتے گی تو بگڑا کرے، اب تو وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی. اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے......

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی، اگر نصیبن اُسے نہ پکارتی: "اجی میم صاحب، اُٹھو، سورج نکل آیا!" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، اور چاروں طرف دیکھا، اب تو واقعی اُسے چلنا چاہیئے تھا. مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اُترنے سے پہلے اُس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیئے پر سر گرا۔

وہ مُنہ دھو دھا کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی. نصیبن لکڑیوں کو چولہے میں ٹھیک کرتے ہوتے بولی: "وہ منسیاین کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہوگئیں. کبھی آکے بھی نہیں جھانکتیں.... اجی ہو ہی آؤ اُن کی طرف، میم صاحب کسی دن. بڑا یاد کریں ہیں تمہیں۔"

ہو ہی آتے اُن کی طرف ـــــ کیا کرے وہ جا کر؟ میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے،

ٹوٹے ٹاٹے ـــ یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے! بس انہیں تو یہ قصّے سنائے جاؤ کہ اُس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، اس کو اتنی تکلیف ہوئی، اُس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصّے انہیں سنانے کو۔ اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں..... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں، سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پہ چڑھی جاتی ہیں.... اُسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے، مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے.. جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی ہوں.... اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے، اور اُن کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اُڑا لے گی...... یا اُس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ اُن کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوّا ہے؟ ـــ عجب بیوقوف ہیں یہ عورتیں بھی! ـــ اور ہاں جب وہ اُن کے ہاں جاتی ہے تو اُن کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں، وہ اندر سے جھانک جھانک کر اُسے دیکھتی ہیں، اور اگر کہیں اُس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں، اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ اور اگر کبھی کسی کو سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چُراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب ڈوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اس کی نظر اُن میں سے کچھ چھین لے گی، یا اُس کی گندی چھوت سے اُن میں کوئی گندگی لگ جائے گی ـــ اُن کی یہ حرکت اُسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اُس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں؟ ـــ اس سے تو اُن کے ہاں نہ جانا ہی اچھا۔ بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں ـــ اور وہ گندے بچے مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھ ننگے، پیٹ نکلا ہوا وہ سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اُسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں جیسے وہ کوئی نیا پکڑا ہوا عجیب و غریب جانور ہے۔ ـــ ـــ ـــ ـــ

ـــ اور جب وہ اُن سے بولتی ہے، تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں ـــ وحشی ہیں بالکل۔ جانور..... بالکل ـــ اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی اُن کے ہاں

چھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں۔ اور کوئی کیوں اُن کے یہاں جا کر بیماری مول لے ــــ اور اُن کے مرد، کتنی شرم آتی ہے اُسے اُن کی حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں، اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہونچ جائے نہیں ہٹتے ــــ "ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اُٹھتے اُٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے ــــ جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں ــــ تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں ــــ اور جب وہ اندر پہونچ جاتی ہے تو اُسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بدتمیز ہیں ــــ انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہو عورتوں کی ــــ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھے آدمی تھے بیچارے۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ بلکہ اُسے تو وہ پہچان گئے تھے ــــ سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا ــــ وہ خود ــــ ڈینا ــــ کٹی ــــ میری ــــ شیلا ــــ اور ہاں مرسی ــــ مسز جمیس کا کتنا مذاق اُڑاتے تھے سب مل کر۔ سب سے پیچھے چلتی تھیں چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی اور اُن میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس ــــ اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے آپس میں ہنستے، مذاق کرتے ــــ اُفوہ، شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی۔ کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی ــــ مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ــــ اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ــــ اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اوّل تو اُسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے ــــ اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے ــــ جیسے جانور ــــ نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو۔ بس آؤ اور پڑ رہو ــــ لے دے کے رہ گئی نصیبن، تو اُسے اِس کے سوائے کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اُس کا بیٹا بھاگ گیا، اُس کی لیپنے میاں سے لڑائی ہو گئی؛ اُس کے یہاں برات بڑے دُھوم دھام سے آئی ــــ اُسے کیا ان سب باتوں سے، ہوا کرے، اِس سے مطلب ــــ یا بہت ہوا تو اُسے خواہ مخواہ ڈراتی رہیگی

چوروں کے قصّے سُنا سُنا کر ــــ ایک دفعہ اُس نے سُنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی ٹنڈا ٹھن کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے، اور اُس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ــــ بکتی ہے، بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے ــــ لیکن اگر کہیں اُس کے ساتھ ــــ مگر نہیں، بیکار کا ڈر ہے۔ جو یوں ہوا کرے، تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں۔ بھلا دُنیا کا کام کیسے چلے ــــ پاگل ہو بڑھیا۔ بہکا دیا ہے کسی نے اُسے ــــ مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار۔ نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ــــ اگر وہ مُڈل فیل نہ بنتی تو اچھا تھا۔ اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی، بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ــــ کتنے دن ہوگئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ــــ بارہ سال۔ کتنا زمانہ گذر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ــــ کتنا پیار کرتے تھے وہ اُسے ــــ روز اسکول پہونچانے جاتے تھے ساتھ ــــ کلاس میں اُس کی سیٹ میز کے پاس تھی ــــ اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے آدمی تھے بیچارے، چاہے وہ کام کر کے نہ لے جاتے، مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ــــ اور لڑکے تو نہ جانے اُسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا۔ سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اُس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ــــ ارے، وہ موٹا کرم چند بھلا وہ بھی تو اُس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اُسے ــــ اور ہاں وہ عظیم! ــــ بڑا بھولا تھا بیچارا۔ سوکھا سا، زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اُس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اُس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اُسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر مُنہ پونچھنے لگتا تھا ــــ اوہ، اُس دن وہ دل ہی دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اُس دن وہ اتفاق سے جلدی آ گئی تھی۔ برآمدے میں دوسری طرف سے وہ آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس پہونچ کر وہ رُک گیا، اور کچھ کہنے سا لگا، ڈرتے ڈرتے عظیم نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا۔ اُسے گھبرایا ہوا دیکھکر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اُس نے بڑے گڑگڑا کر

کہا تھا" کہیئے گا نہیں" ـــــ وہ کتنے دن تک اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ـــــ
کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ـــــ وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ـــــ مگر ـــــ
وہ زمانہ تو اب گیا۔ اب تو وہ یہاں اکیلی دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو
نہیں ـــــ کسی کا خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روز ڈاکیئے سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں
مگر روز وہی جواب: "نہیں" ـــــ اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے ـــــ
آن ہز میجسٹیز سروس ـــــ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں۔ یوں کرو اور یوں کرو۔ کوئی
اُس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے۔ خواہ مخواہ کی آفت ـــــ اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟
ـــــ اگر آنٹی ہی دلّی سے خط بھیجد یا کریں تو کیا ہے، مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں
ـــــ ایک دفعہ جانا چاہیئے اُسے دلّی ـــــ اچھا شہر ہے۔ کیا چوڑی سڑکیں ہیں ـــــ اور سینما
کس کثرت سے ہیں ـــــ اور وہ ـــــ وہ تو خیر ہے ہی ـــــ مگر وہ ـــــ

کائیں، کائیں، کائیں نے اُسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اُتر آئی تھی، کوّا زور زور سے چیخ رہا تھا، اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ اُسے جلدی جانا تھا، اور اُس نے بیکار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصّہ اُتارنے لگی کہ اُس نے چائے کیوں نہیں لاکر رکھی۔ مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں۔ اور واقعی، اُس نے خیال کیا، اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اُس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اُس نے دوبارہ مُنہ دھویا۔ اور اُلٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کون سی ساڑھی پہنے ـــــ سفید، سُرخ کناروں والی ـــــ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ ـــــ اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے۔ اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی ـــــ نیلی ساڑھی نیچے سے چمک رہی تھی۔ ـــــ اِسے ہی کیوں نہ پہنے؟ ـــــ مگر اُسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے

ہو جائیں گے — وہ جدھر سے نکلتی ہے، سب کے سب اُس کی طرف گھورنے لگتے ہیں۔ اُسے بڑی بُری معلوم ہوتی ہے اُن کی یہ عادت — اور ان زمینداروں کو دیکھو۔ بڑے شریف بنتے ہیں! — خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں، اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں — "کہو یار!" — "ابے مجید، ذرا بیچو!" — کوئی کھانسنے لگتا ہو — کیا وہ سمجھتی نہیں — ذرا شہر میں کر کے دیکھتے ایسی باتیں۔ وہ مزا چکھا دیتی انہیں — مگر یہاں وہ کیا کرے، مجبور ہو جاتی ہے — اُن کی ہی توجہ سے اُس نے رنگ دار ساڑھیاں چھوڑ دیں، اور سفید پہننے لگی۔ مگر پھر بھی نہیں مانتے — اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی، تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے — تو پھر سفید ہی پہن لے — مگر روز روز سفید — اور کیا وہ کوئی اُن سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اُسے کھا تھوڑے ہی لیں گے۔ بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اُس کا؟ — اب وہ پھر رنگ دار ساڑھیاں پہنا کرے گی۔ دیکھیں وہ اس کا کیا بنا لیتے ہیں — ہنسیں گے تو ضرور — مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے — آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی۔

نیلی ساڑھی پہن کر، اُس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اُس کی آنکھیں لال اور کچھ سُوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اُٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی — مگر یہ اُس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا، اور کھال بھی کھُردری ہو چلی تھی — جب وہ لڑکی تھی تو اُس کے چہرے پر کیسی چمک تھی — رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا — اُس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں: "تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے!" — مگر اب —

اُس نے آئینہ رکھ دیا، اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مورا اپنے پیروں کو — اُس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے، اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے۔ اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سا کھے، اور ہلکے رہ گئے ہیں، اور تیزی تو

اُس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی، اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اُس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اُس نے ایک لمبی سی انگڑائی، اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اُڑا دیا تھا۔ اُس نے بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو اِدھر اُدھر اُڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے، مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی، اور اُس کا دماغ سمٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا، جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اُس نے آئینہ رکھا تو اُسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اُس کے پاپا نے اُسے دی تھی۔ مدّتوں سے اُس نے اُسے کھولا تک نہ تھا، اور وہ گرد سے اَٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اُسے پھر پاپا کی یاد دلا دی! اور وہ اُسے اُٹھانے پر مجبور ہوگئی۔ پہلے ہی صفحے پر اس کا نام لکھا تھا۔ یہ خود اُس کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اُس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی ہنسی آئی کہ اُس وقت وہ کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس زمانے میں اُس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اگلے جب وہ شہر جائیگی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لیکر کریگی ہی کیا؟ اب اُسے کونسا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اُس کے پاپا اُسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اُسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی، اور وہ بائبل کے ورق اُلٹنے لگی ــــ پیدائش ــــ خروج ــــ ورق تیزی سے اُلٹے جانے لگے ــــ استثنا ــــ روت ــــ یرمیاہ ــــ حبقوق ــــ متی ــــ لوقا ــــ رسولوں کے اعمال ــــ کہاں سے پڑھے ــــ آدم ــــ نوح ــــ طوفان ــــ ابراہیم ــــ کشتی ــــ صلیب ــــ مسیح ــــ یسّو راجا آتے ــــ گرجا کا گھنٹہ ــــ سب مل کر گرجا

جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے ـــــ

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے۔ اور پھر اُسے جلدی جانا تھا، اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ لیکن اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائبل پڑھا کریگی ـــــ ورنہ کم سے کم اتوار کو تو ضرور ـــــ لیکن دُعا تو مانگ ہی لینی چاہیئے ـــــ بہت ہی بُری بات ہے۔ ماما کبھی بغیر دُعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں ـــــ اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا ـــــ اور لگے بھی تو کیا ہے۔ دُنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اُس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر باوجود اُس کے آنکھیں بھٹ پھٹانے کے پہلے تو اُس کی ماما اُس کی آنکھوں میں گھُس آئیں، اور پھر پاپا، اور اُن کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک، گھنٹہ، اور سب جو مل کر گرجا جایا کرتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دیئے گویا وہ ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے ـــــ آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا، اور خاموش؛ صرف کانوں اور سر میں دِل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، دونوں ہاتھ جوڑ لیئے، اور دُعا کو دُہراتی چلی گئی۔ "اے میرے باپ، تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں، کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین۔"

آنکھیں کھولنے پر اُس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا، اور مُسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

اُس نے پھر آئینے میں جھانکا، اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دُعا مانگے ـــــ لیکن کیا چیز؟ ـــــ کوئی؟ ـــــ اُس کا تبادلہ شہر کو ہو جائے ـــــ مگر وہاں اُسے پھر ولیمسن کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے ـــــ پھر اور کیا؟ ـــــ وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ پھر آخر کیا؟ ـــــ

اُس نے بہت بازو ملے، مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اُسے دیر ہو رہی تھی، اس لئے اُس نے اپنی دُعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا، اور چھتری اُٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہونچکر اُس پر محض ایک جلدی پہونچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اُسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی اور چلنے سے اُس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی، اور وہ سڑک کی نالی، ریت، کنکروں سب سے بے پروا اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اُسے کبھی اپنی رفتار میں کچھ سستی معلوم ہوتی، تو وہ اور قدم بڑھانے کی کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے، اس لئے اُسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سائے میں ہو گزرتی تھی، تو اُس کے پیر اور بھی تیز اُٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہونچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اُسے اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ یکایک اُس کی نظر ایک دُکاندار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا، اور مسکرا رہا تھا —— کیا یہ اُسے دیکھ کر تھا؟ —— ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اُسے دیر بھی ہو گئی تھی —— وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی، "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی........ بڑے دن میں ہوا ہے ایسا آج"۔ —— اُس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے .... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہدے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے، اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی —— آخر کہاں تک؟ —— پیر من من بھر کے ہو گئے تھے، اور ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی —— مگر اُن آنکھوں نے جواب ہر طرف سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں اُسے رُکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سُکڑ سی گئی۔ اُس نے پلّہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا، اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اُکھاڑنے لگی......

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہونچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اُس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اُس سے ہمدردی تھی، بولے:

"آخاہ میم صاحب..... بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی... ہاں... وہ ذرا دیر ہو گئی" یہ کہتی ہوئی وہ زنانے کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازے پر پہونچی تو اُس نے دیکھا کہ قصبے کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اُٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا بالٹی صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی: "جرا دیکھو تو..... ابھی تک نا نکلی گھر وسے سے حرام جادی!"

۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

"ادبی دنیا" سالنامہ ۱۹۴۱ء

میلاد شریف

ابھی شیخ جی یہ طے کر رہے تھے کہ جمعرات کا دن رکھیں یا جمعہ کا، اور بڑے بتاشے ہوں، جلیبیاں یا لڈو، کیونکہ چار بتاشوں کے مقابلے میں چار جلیبیاں نرا ہلکی پھلکی چیز ہیں اور مزیدار بھی، اور پھر نام بھی زیادہ ہوتا ہے، لڈو گول گول ہوتے ہیں اور ٹھوس، اس لئے پُر وقعت معلوم ہوتے ہیں... کلو حلوائی کی تھال کے زرد زرد لڈو تو ایسے اُبل رہے تھے جیسے کوئی پوشیدہ اسپرنگ لگا ہو۔ لیکن لڈو تو بہرحال لڈو ہے، گرا اور ٹوٹا۔ موتی چور کے لڈو کی زرد بندیاں یا رستے کی طرح زمین پر بچھا گئے لگیں... اور اگر بندیاں ہوں تو کٹوری میں بھر بھر کر دی جا سکتی ہیں، ..."اماں دونوں ہاتھ پھیلاؤ گی، گریں گی بھی کہ نہیں!" رحیم اللہ راستے ہی میں کھا لے گا، کمر ٹیڑھی کر کر کے۔ ایک ایک منہ میں ڈالے گا جیسے چنے کے دانے۔ پھر بندیاں ہیں! کہاں ہوتی ہے ایسی روز بندیوں کی میلاد شریف... مگر عنایت کے تو دونوں بازوؤں میں ایک ایک لڈو پھنس گیا، اور وہ شیخ جی کے آخری فیصلے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا، اور بےقراری سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بازار کی طرف چل دیا۔

سب سے پہلے اُسے نتھو سقہ ملا جو اپنے بیٹے کو گالیاں دیتا آ رہا تھا۔ وہ عنایت کی خوشخبری سے محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ اُسے صاف نظر آ گیا کہ یہ بدمعاش عزیز مولود کے بہانے سے جمعرات کے دو بجے تک غائب رہیگا اور اگلے دن آٹھ بجے سو کر اُٹھے گا اور آدھے گھروں

کا پانی خود اُس کے سر پڑ جائے گا۔" "مولود؟" اُس نے رک کر کہا۔ "ہاں، ہوتی ہی رہتی ہے مولود!" عنایت کو اپنے کندھے تو ضرور اونچے نیچے کرنے پڑے، مگر اُس نے اپنے جوش کو سرد نہیں ہونے دیا، اور ارادہ کر لیا کہ اب کے ذرا انتخاب سے کام لے گا۔ سلامت آج بے طرح کھانس رہا تھا، داروغہ جی کے بیٹے کے کپڑے آج بہت سفید تھے، اور کالا سینڈل چمک رہا تھا، اور پھر اُن کی بغل میں انگریزی کی ایک بہت موٹی کتاب تھی۔ آم والا ہتب، لالہ رام پرشاد کو آم دے رہا تھا، مگر اُس کے کچھ پیسے عنایت پر باقی تھے۔ اُن لوگوں کے چہرے اُسے امید افزا نہ معلوم ہوتے، اسی لیے اُس نے اپنا چہرہ خشک بنا لیا، دانت خوب بھینچ لیے، اور سینے کے پٹھوں کو پھیلا دیا کہ کہیں یہ زرد گول اور میٹھی خبر اُس کے اندر سے نہ اُڑ جائے۔ یہاں تک کہ جب اُسے گلابو بھنگن گھروں سے روٹیاں جمع کرتی ہوئی ملی تو اُس نے اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ "اری پیسے کی کے میرا؟" لیکن بازار کے نکڑ پر چھدّن کو دیکھتے ہی بازوؤں میں پھنسے ہوئے دونوں لڈو اُس کے جبڑوں میں آکر جھولنے لگے۔ اُس نے چھدّن کو پکارا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اُس کی طرف جھپٹا، اب تو سینکڑوں لڈو اس کے گلے میں، سینے میں، ہاتھوں میں، ٹانگوں میں کود رہے تھے، کود ہی نہ رہے تھے بلکہ نکلے پڑ رہے تھے۔ اُس نے چار گز کے فاصلے ہی سے چیخ کر کہا "ابے چھدّن، مولود ہے رے!"

چھدّن کے گلے کی رگیں لپک پڑیں "مولود؟" اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے کوئی ڈاکہ کی خبر سُنی ہو۔ "میری قسم؟"

"ہاں، ہاں بے!"

"میری قسم کھا!"

"کہہ تو رہا ہوں بے کہ مولود ہے، مولود ہے، اور وہ مانتا ہی نہیں!"

"تبے کاہیں کی دیسے؟ بتاسوں کی؟"

"بتاسوں کی؟ ریوڑی ملے گی پاؤ پاؤ بھر"

"ابے چل!" اپنے لہجے کا طنز محسوس کر کے چھدّن نے انداز بدل دیا، اور ملتجیانہ کہا، "ٹھیک ٹھیک بتا لے۔"

"اچھا، لے ٹھیک ٹھیک۔ دو دو آم ملیں گے ایک دونے میں رکھ کے۔"

"ابے تو تو ہر وقت وہی بس..... ٹھیک بتا۔"

عنایت نے بہت احتیاط سے خوان پر سے کپڑا اٹھایا۔ "لڈو ہیں چار چار۔ تمہارے تو آٹھ آٹھ ہو گئے۔"

"میری قسم؟"

"اور کیا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

"اچھی ہاں؟"

"کھئی تیری جان قسم۔"

اب جا کر چھدّن کی کنپٹیوں کی رگیں ڈھیلی پڑیں، اور اس نے اپنے آپ کو سانس لیتا ہوا محسوس کیا۔ جب وہ آٹھوں لڈوؤں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اچھی طرح سنبھال چکا تو اسے دوسری غیر اہم معلومات حاصل کرنے کا خیال آیا۔ "یہ کس کے ہیں؟" اس نے بہت ہی ہلکے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"شیخ جی کے ہیں، بنیاد علی کے۔"

راکھ پر پانی پڑا، اور راکھ بیٹھ گئی۔ "شیخ بنیاد علی کے؟" چھدّن نے ٹانگ ڈھیلی کر کے اس مسئلہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا، دیکھو پوچھوں ہوں استاد سے۔"

لیکن استاد کریا پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ بات کبھی نہ بھولی تھی کہ پہلے مولود میں شیخ بنیاد علی نے اتنی چھوٹی چوکی بچھائی تھی کہ اس پر ان کی پارٹی کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی کیونکہ شرفو کی پارٹی پہلے ہی سے آکر ڈٹ گئی تھی؛ ان ہی لوگوں کے حافظ نے بیان پڑھا

تھا، اور ان ہی نے پنج آیت شروع کی تھی، اور سلام بھی اُن ہی کا تھا۔ اُستاد کریما نے دروازے سے نکلتے ہی اپنے سب شاگردوں سے کہہ دیا تھا: "دیکھو، اصل کے ہو تو اب سے یہاں نہیں آنے کے ہو۔" اُنہیں بدلہ لینے کا ایسا موقع خدا دے۔ گو چھدّن نے پیش بینی سے کام لیتے ہوئے لڈّوؤں کا ذکر پہلے ہی کر دیا تھا، مگر شیخ بنیاد علی کا نام سن کر وہ اپنے شاگردوں کو بتاتے بغیر لڈّوؤں کو پورا ہی نگل گئے، اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو اُن پر بیٹھ گئے۔ پھر اُستاد کا بوجھ تھا، لڈّو ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل گئے۔ مٹی میں نہ بھی ملے ہوں، کم از کم اُن کی نظروں سے تو اوجھل ہو گئے۔ اس عمل سے اُن کی آواز میں ذرا ارادے کی کرختگی پیدا ہوئی، اور اُنہوں نے چھدّن کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "کیا کہا، شیخ بنیاد علی کے؟ کیوں بے اُلّو کے پٹّھے، کیا قسم کھائی تھی اُس روز؟ ... سالے ہو نہ کمینے، آخر کہاں جائے اصل؟ یاد نہیں کیسی اُس روز ذلّت ہوئی تھی؟ نیچے پڑے رہے۔ سلام بھی اُنہوں نے ہی پڑھا، اور پنج آیت بھی اُنہوں نے ہی شروع کی۔ جیسے جوتیوں میں بیٹھنا ہو وہ جائے۔ جو اصل کا ہوگا وہ تو جائے گا نہیں۔ اب تمھی کہو انصاف سے کہ ایسی جگہ جانا چاہیئے کہ نہیں؟ میاں، شریفوں کو تو ذرا سی بات لات کے برابر ہوتی ہے۔"

عزیز اور کاوا دونوں کے نزدیک انصاف کی بات یہی تھی کہ نہیں جانا چاہیئے کیونکہ یہاں تو تجربے معرضِ بحث میں آ گئے تھے؛ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ چاہے ذلّت ہوتی یا نہ ہوتی ہو مگر چھدّن کو تو سر کھجانا پڑ رہا تھا۔ ان دونوں کو تو اپنی گردن کی نسوں کی گدگدی میں کافی مزا آ گیا تھا، مگر بیچارے چھدّن کے خشک اور بوجھل ہونٹوں نے اُن آٹھ میں سے صرف دو لڈّوؤں کو کوٹھے کے اُدھر اُڑ کر جاتے ہوئے دیکھا۔

لیکن اُستاد شرفو کے یہاں اس خبر کو زیادہ پُرسکون اعصاب کے ساتھ سنا گیا۔ اُنہوں نے انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ آواز میں کہا: "اچھا!"

رشید اس چکّر میں تھا کہ استاد کی آواز میں نا رضامندی پاسے یا شک یا بے پروائی لیکن خیر اس کی گردن ڈھلکنے سے پہلے ہی استاد نے ہاتھ کو گھٹنے پر آتارتے ہوئے دہرایا: "تو مولود ہے ... ہے کس روز؟ شیخ جی کے ہے؟"

"ہاں، شیک جی کے، جمعے کے روز ہے، عشا کے بعد۔ ون کی پالٹی نا آرئی ہے۔ منع کر دیا کرہیا لنے۔ کہہ دیا کہ ہم نہ جانے کے ہیں شیک جی کے، رو ون ہمیں نیچے بیٹھنا پڑا، سلام بھی ونہوں لنے ہی پڑھا، اور جو اصل کا ہوگا وہ تو جلسے کا نا ہے!"

رشید کو پُر اشتیاق آنکھوں کو مایوس نہ ہونا پڑا۔ استاد کی ڈاڑھی تیزی سے جھرجھرائی، اور انہوں نے غائب کر دیا کو ڈانٹ سکنے کی جرأت کا لطف اُٹھاتے ہوئے کہا: "نہ آدمیں گے سالے تو مت آؤ۔ کوئی مولود نہ ہوگی ون کے بغیر؟ کیا اور پڑھنے والے نا رہے ہیں؟ کس بات کی ہو وھونس ان کی؟ کوئی وبلے سبے ہیں شیخ جی ون کے، یا کیا ہے؟ کینے ہیں سالے۔ ابھی بتا دیں ڈانٹ تو بولیں آگے آگے۔ ایسے ایسے تو ہم نہیں جانتے چریں ہیں سینکڑوں!"

"اور کیا!" رشید نے لہجے میں وقار پیدا کرتے ہوئے تائید کی۔

"ہاں جی، یہ تو ہے ہی!" اسمٰعیل جوش میں پٹّی پر کھسک آیا تھا: "رہیں ہیں صاحب، کون ہے ون کی برابر کا قصبے میں۔"

گیند گدا کھا کر اور اچھلی: "اور وہ بھول گئے جب خوشامدیں کرتے پھرتے تھے، جب مقدمہ چلا تھا۔ ٹوپی ڈال دی تھی شیخ جی کے پیروں پہ۔ جو شیخ جی دروغا جی سے سفارش نہ کریں تو کاٹتے ہوتے جیل، بھول جاتے سب، کھا کھا کے ڈنڈے۔ ابی، شیخ جی ہی کچھ ڈھیلے ہیں ہمارے، اک لگواتے دو دو جوتے تو ہو جاتے ٹھیک۔ پر کیا کریں، شیخ جی ہی بچارے سیدھے سادے ہیں۔"

"بہت سیدھے ہیں واقعی شیخ جی بھی!" رشید نے لہجے میں رقّت پیدا کرتے ہوئے تائید کی۔

"بھئی ہاں!" اسمٰعیل دونوں ہاتھ پٹی پر رکھ کر اوپر اُٹھ گیا تھا۔ "یہ تو ہم بھی کہیں گے، بڑے ہی سیدھے ہیں شیخ جی!"

"رئیس ہیں، بھائی! رئیس کو ہونا ہی چاہیئے ایسا!" اُستاد نے اپنے سامعین کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کہنا شروع کیا۔ "اور ان کے باپ تھے، صاحب! کیا بتاؤں کیسے آدمی تھے۔ وہ رعب تھا کہ کوئی نکل تو جائے سلام کئے بغیر سامنے سے۔ چار پانچ آدمی جمع ہی رہتے تھے ہر وقت۔ مجھے تو وہ بیٹا کہیں تھے۔ مجھ سے کہتے، اے بیٹا شرفو، چلم تو بھر لا۔ اب میں چلم لے کے اندر پہونچا۔ ابھی آگ منگائی ہے چلم میں، ہُوا، وہیں سے چلائیں، ارے تھم تھم، میں آئی، آگ اُجاڑ کے رکھ دیگا ساری۔ تھیں وہ بھی بڑی اچھی۔ جب کبھی میں گیا اور وہ چھاچھ بلو رہی ہوتیں تو انہوں نے کبھی چھاچھ پئے بغیر نہیں آنے دیا مجھے۔ لے رے شرفو، چھاچھ پیتا جا! اندر میں لے کے بیٹھ کے کٹورا، لاؤ تو اجی۔ اور بڑا دودھ تھا، تھی اُن کی بھینس بھی۔ ساب، پچپن روپے کی لی تھی انہوں نے بیٹھے بیٹھے۔ جاٹ تھا وہ۔ کہنے لگا، لو سیٹھ جی، کیا یاد کرو گے تم، کہ ویسی کوئی بھینس۔ اور نکلی بھی وہ ایسی ہی زوردار۔ دونوں وقت ۔۔۔"

"کیا ڈینگ مار رہا ہے بے لنگڑے؟" لطیف ہیڈ ماسٹر نے رشید کو مونڈھے پر سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اُستاد نے تو خیر ذرا صبر و بردباری سے کام لیا، مگر رشید اور اسمٰعیل کے کندھے فوراً اوپر تن گئے کہ دیکھیں پہلے کون بتائے۔ اسمٰعیل تو "با ۔۔۔ بب ۔۔۔ با" ہی کرتا رہ گیا، مگر رشید نے باوجود پھولے ہوئے سانس کے مولود کی خبر اور کریما کا حکم سب حال سنا ڈالا۔

"اے چھوڑ یہ جھگڑا!" ہیڈ ماسٹر بولے۔ "یہ بتا کہ بٹے گا کیا؟"

"لڈو، ماسٹر، لڈو!!" اسمٰعیل تُلا ہوا تھا کہ اب کے رشید کو آگے نہ بڑھنے دیگا۔

"لڈو؟" ہیڈ ماسٹر نے اپنی آواز میں سے لڈوؤں کی ساری مٹھاس اور خوشبو نکال دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا روز روز لڈو۔ ہونہہ!"

"تو پھر تمہارے لئے کون بانٹے گا سوہن حلوا؟" اسمٰعیل نے ماسٹر کو اپنا جارحانہ اور غیر انسانی خیال ترک کر دینے پر اکساتے ہوئے کہا۔

مگر ماسٹر بھلا کسی کو ایسی چھوٹی چیزوں پر پھسلتے ہوئے کہاں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا دل میں سوچا ہوا فقرہ انیسویں بار استعمال کیا۔ "اس سے تو اچھا ہے کہ دو دو روٹیوں پہ ایک ایک ہڈی اور چنے کی دال رکھ کے بانٹیں جو پیٹ تو بھرے کسی بھلے مانس کا۔" ماسٹر رشید اور اسمٰعیل کے صرف مسکرا دینے سے مطمئن نہ ہوئے، اور دو سکنڈ انتظار کے بعد انہوں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے خود ہی قہقہہ لگایا کہ ایسے نازک لطیفے عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

جب ٹیلر ماسٹر کے فقرے کے اثرات سے فضا کچھ خالی ہوئی تو رشید نے مصالحت آمیز انداز میں پوچھا۔ "تو چلو گے، ماسٹر، پھر؟"

کچھ بھی، مگر ماسٹر ایسے سنگدل بھی نہ تھے کہ اپنی کلبیت پر اڑے رہتے۔ "جب پالٹی ہی چلے گی تو ہم کیوں نہ جائیں گے؟" اپنے ساتھیوں کا دل رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو ذرا اور ڈھیل دیدینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ "آٹھ آٹھ لڈوؤں کا معاملہ ہے، یار کیوں چھوڑو؟ میرے نواسے کو بیٹھیو لے رشید، لو لو؟"

"کیوں، ماسٹر؟" اسمٰعیل نے ٹیلر ماسٹر کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چکنا چپڑا اچھا لٹو گے؟"

بہرحال، ماسٹر اپنی اس تعریف سے خاصے خوش ہوئے اور ان کی آنکھ کے کونوں نے پھڑک کر اسمٰعیل کو زیادہ تفصیل سے کام لینے پر اکسایا۔ اور رشید کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دونوں جبڑوں میں فاصلہ بڑھ گیا ہے، اور وہ ہونٹ کھول کر اپنے منہ میں ہوا بھرنے لگا۔ یہ اچھا ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً جتا دیا جائے کہ استاد اپنی استادی اور دوسرے اپنی شاگردی نہیں بھولے ہیں، اس لئے استاد شرفو نے بھی اس موقع کو اپنے مقصد

کے لئے استعمال کرنا ضروری سمجھا: "دیکھو بھئی!" اُنہوں نے اپنے شاگردوں کو جھنجھوڑا: "ایک بات تو ہم کہیں گے۔ چاہے تم مانو یا نہ مانو۔ جو مولود پڑھو تو اپنے فعل تو ٹھیک رکھو۔ بس ہر وقت وہی باتیں، کچھ اور بھی رہ گیا ہے تمہیں کرنا؟ اور ایک یہ ہیں، ماسٹر۔ ڈاڑھی گھٹ منڈ۔ اور مونچھیں دیکھو تو لال لال۔ جیسے زنخے۔ اور نماز تو اس نے کبھی پڑھ کے ہی نہ جانی!"

"کون؟ نماز؟ کس نے نا پڑھ کے جانی؟"

"تو نے!" اُستاد نے ماسٹر کے تین سال دلّی میں رہنے کا رعب نہ مانتے ہوئے کہا۔ "اور کس نے؟"

"میں نے؟ میں نے؟ میں نا پڑھتا ہوں نماز؟"

"تو دیکھا ہے کسی نے آج تک تجھے پڑھتے نماز؟"

"تو کوئی میں دکھانے کو پڑھتوں ہوں نماز تیری طرح؟" اور ماسٹر نے اپنے دہلی کے ایک دوست کے فقرے کو برہان قاطع کے طور پر پیش کیا: "میں تو تہجد کے ساتھ ملا لوں ہوں سب وقت کی نمازیں، یار!"

"تہجد کے ساتھ ملا لے ہے!" اُستاد نے پست نہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے طنز سے کہا تاکہ دوسرے شاگردوں کی مسکراہٹ ختم ہو جائے: "ابے کچھ تو خیال کیا کر، دنیا کیا کہے گی۔ چڑھ کے بیٹھ گئے تخت پر مولود پڑھنے، اور فعل دیکھو تو ایسے!"

"ابے رہنے دے، بڑا بنا ہے پاک!" اسمٰعیل اور رشید کی ہنسی نے واقعی بچارے ماسٹر کو اس پر مجبور کر دیا تھا: "تو پھر کھولوں تیری ——"

لیکن اُصول تو آفاقی حقائق ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اُن کی بحث میں اُستاد کو ذاتی سوانح عمریوں کا ذکر — جب کہ وہ خود اُن کے بارے میں ہو — قطعاً پسند نہ تھا۔ اس لئے اُنہوں نے گفتگو کو دوسرا رنگ دینے کے لئے کہا: "بس چھپا ہے رہیں ہر وقت، کہیں سلوٹ

نہ پڑ جاتے کپڑوں پر، ہمیں نماز پڑھنی ہیں!“

”جنٹل مین ہیں صاحب ماسٹر، کوئی ایسے ویسے ہیں!“ اسمٰعیل اپنی شکایت کو جو اپنا ایک پُرلطف واقعہ بن گئی تھی زیادہ دیر نہ روک سکا: ”وہ اس دفعہ گئے تھے تاجمال پور مولود پڑھنے۔ بڑا دِق کیا ماسٹر نے راستے میں۔ اپنے آپ نہ چلا گیا اُتر کے، ڈٹے رہے گاڑی میں۔ سارے راستے مجھے ہی گھسیٹوایا۔ جوتا خراب ہو جائے گا میرا، جیسے بڑا بڑھیا تھا آپ کا جوتا!“

”ابے، پانچ کا تھا پانچ کا!“ ماسٹر اپنے جوتے کی اہمیت واضح کرنے سے کبھی نہ چوکتے تھے، اور اس وقت تو اس پر حرف آرہا تھا۔ ”دیکھنے کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔“

”پانچ کا ہو چاہے دس کا، پھر تو تُڑوا دیتے تم نے میرے۔“

”تو چار پیسے جو لیتے تھے تو نے دو دو، دو کو؟“ مذاق تک تو خیر کوئی بات نہ تھی، مگر شک کا بہتا آمیز لہجہ ماسٹر کو پسند نہ آیا تھا: ”ابھی تک نہیں لوٹائے ہیں تو نے وہ چار پیسے، بیٹھ ہی گیا ہضم کر کے؟“

اُستاد نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے خیال سے کہا: ”مگر ماسٹر، چائے بہت اُڑائی تم نے جلال پور میں۔ وہ بھی کہتے ہوں گے کہ کیا چٹورے ہیں یہ میں گے۔“

”چھوا!“ بد مذاقی کا الزام ماسٹر برداشت نہیں کر سکتے تھے: ”چائے تھی وہ؟ اوٹنے ہوئے پانی میں گڑ گھول دیا جیسے۔ گنوار وا! ارے چائے ہم نے پی ہے دلّی میں۔ پہنچ گئے صبح ہی صبح، اک کھینکے چار پیسے، لو جی، بناؤ ایک پیالی۔ بس صاحب دی اس نے بنا کے، دو دو انگل ملائی چڑھی ہوتی۔ اور جو ذرا کم ہوتی تو ڈانٹا، کیوں جی، یہ کیا دی ہے، دیگچی کا دھوون۔ فوراً کہا اس نے، اجی لو، لو، ناراض مت ہو، اور لو ملائی، ملائی کی کیا کمی ہے۔“

ماسٹر تو دلّی کی ملائی پر ہونٹ چٹخا رہے تھے، مگر ملائی کی چکنائی اسمٰعیل کی آنکھوں کو ماسٹر کے ہونٹوں پر چپکا ہوا نہ رکھ سکی تھی، اور وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے والے بنئے کی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کو لینے کے لئے باہر نکلی تھی جو نالی کے کنارے کھڑی روٹی کا ٹکڑا

کھا رہی تھی۔ ان لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر اُس کے کولھے اور زیادہ مٹکے، کمر میں اور بل پڑے، کندھے اور آڑے ترچھے ہوئے۔ اُس نے اپنی بانہہ ساڑھی میں سے اور ذرا باہر نکال دی، اور "للّی!" کے بجائے آواز میں جھنک پیدا کرتے ہوئے "لیل لی ای!" پکارنے لگی۔ اسمٰعیل کی دونوں پنڈلیوں میں گدگدی ہوئی، اور اس کی انگلیوں کے سرے بوجھل معلوم ہونے لگے۔ پہلے تو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا رہا، لیکن مصنوعی غصّے سے پھولی ہوئی سُرخ ناک دیکھ کر اور "ناچتی ہے تو میں چھوٹے جاؤں ہوں" سُن کر، اُس نے اپنی ٹانگیں سکوڑ لیں، اور "رُخسار سے بُرقع کو اُٹھا کیوں نہیں دیتے" گانے لگا۔ اب تک اوروں نے بھی اس گانے کے ماخذ کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن اُستاد لڑکی کو دیکھنے کے بجائے شوخ آنکھوں سے اسمٰعیل کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ، "ہم بھی تاڑ گئے ہیں، مگر خیر، جاؤ چھوڑتے ہیں۔ ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں تمہارے۔" رشید کی مسکراہٹ یہ بتانے کیلئے بے تاب تھی کہ اُسے چھوٹا نہ سمجھا جائے، وہ بھی ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ٹیلر ماسٹر ٹیڑھے سے بے پروا اور متین بنے ہوئے تھے — یہ ظاہر کرنے کے لیئے کہ وہ دہلی میں جن میم صاحب کے یہاں کام کرتے تھے وہ ابھی ولایت سے آئی تھیں، اور بڑی خوبصورت تھیں اور ماسٹر کو اپنے آپ بُلا کر چائے دیا کرتی تھیں، اس لئے انہیں ایسی دمڑچی لونڈیوں سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، اور صرف سانسوں کی آواز آتی رہی۔ یکایک اسمٰعیل نے چونکتے ہوئے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ اُن سے کسی بڑی چیز کی درخواست کر رہا ہو اور اُسے معلوم ہو کہ وہ انکار کر دینگے، "مولود میں یہی نعت پڑھیں گے! رہیگی تو اچھی۔"

ٹیلر ماسٹر اس جذباتیت کو وہیں ختم کر دینا چاہتے تھے۔ وہ انکار کرنے ہی والے تھے کہ سامنے مٹھائی کے دیوانجی جاتے نظر آئے۔ "دیوانجی ہیں کیا؟" اُستاد نے پوچھا۔

"ہاں، دیوانجی ہی ہیں۔" رشید نے یقین دلایا۔

"دیوانجی کو بھی دعوت دیدیں مولود کی؟" اُستاد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میں کہہ دوں بھاگ کے دیوان جی سے؟" اسمٰعیل نے پوچھا۔
"اچھا کہہ دے" اُستاد نے کہا، مگر پھر کچھ سوچ کر بولے: "ذرا ٹھیر، میں ہی جاؤں ہوں۔ میں ہی کہوں گا دیوانجی سے۔"

جب سے بُوا فاطمہ نے یہ سُنا تھا کہ شیخ بنیاد علی کی بیٹی شفیقہ چھ سال بعد آگرے سے آئی ہے، وہ بہت بے چین تھیں کہ کسی طرح اُس سے ملیں، اور اُن کے علاوہ ان کی بھتیجی زینت بھی، اور وہ نئی سپاہن بھی جو جلدی ہی اُنہیں بُوا کہنے لگی تھی اور اب دوپہر کا وقت اُن ہی کے ہاں گزارتی تھی۔ خاص طور پر وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ شفیقہ آگرے سے کس رنگ میں رنگ کر آئی ہے؛ وہ پہلے ہی کی طرح سیدھی سادی ہے یا ساڑھی یا شلوار یا بڑے پائنچوں کا پیجامہ پہننے اور ٹیڑھی مانگ نکالنے لگی ہے۔ مگر وہ یہ سوچتیں کہ بچّوں کے گھر میں کہاں نکلنا ہوتا ہے، اور کسمسا کسمسا کر رہ جاتیں۔ لیکن جب مولود کی دعوت پہونچی تو انہیں اپنی تمنّا پوری کرنے کا ایک زرّیں موقع ہاتھ آگیا، کیونکہ یہی دو ایک ایسی چیزیں ہوتی ہیں جب جانا فرض ہوجاتا ہے، جیسے کوئی خوشی یا موت یا مولود۔ چنانچہ تینوں نے اپنے اپنے یہاں نہانے کے لئے پانی گرم ہونے کو رکھ دیا، اور دوپہر ہی سے جو کچھ پکانا تھا منگا لیا تاکہ مغرب کے وقت تک کھانے دانے سے فارغ ہوجائیں۔

گو سپاہن نے نہانے میں بہت دیر کردی تھی جس پر بُوا فاطمہ بہت بگڑی تھیں، مگر پھر بھی عشا سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ سب تیار ہوگئیں اور چار بچّوں اور بُوا فاطمہ کی بڑی لڑکی کلثوم کو ساتھ لے کر چل پڑیں۔ سپاہن نے آج اپنا اکیلا بڑے پائنچوں کا پیجامہ پہنا تھا، اور کچھ دیر سوچنے سلجھنے کے بعد ٹرنک میں سے اپنا تین روپے والا ریشمی سرخ بُرقع بھی نکال لیا تھا جس کے دو حصّے تھے۔ اس بُرقعے کو ایک منٹ تک دیکھنے کو

ہماری زینت کے پوپلے ہونٹ کچھ اس طرح کھلے رہ گئے جیسے ان میں پلکیں نہ رہی ہوں، اور اس کے بیچ کے دانت اوپر کے دانتوں میں گڑنے لگے، مگر جب بوا فاطمہ نے کہا: "اری، کیا ہے یہ نیرا بیڑا، ہاتھ تو سارے باہر نکلے ہوئے ہیں!" تب جاکر اس کے ہونٹ کچھ ڈھیلے پڑے اور اس نے اپنا پرانی وضع کا سفید برقعہ جھاڑ کر اوڑھ لیا۔

جب یہ چاروں شیخ جی کے یہاں پہنچیں تو وہاں ابھی تک کھانا ہی کھایا جا رہا تھا۔ بچے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اس لئے انہیں اپنی جوتیوں سے پھٹ پھٹ کرنی پڑی، تب شیخ جی کی بیوی چونکیں اور انہوں نے چولھے کے پاس سے پکارا: "اجی، بیٹھو بیٹھو!" جتنی دیر میں شیخ جی نے پانی پیا اور ہاتھ دھوئے، ان چاروں کو دالان میں گرمی میں گھٹنا پڑا۔ چلتے چلتے شیخ جی نے بیوی کو بلایا اور آہستہ سے کہا: "دیکھو، باہر چھوٹی والی بیٹی بیٹھی ہے، سمجھیں؟" جب شیخ جی کے جوتوں کی آواز باہر پہنچ گئی، اور بوا فاطمہ نے دروازے کی طرف جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر لیا، تو وہ چاروں ایک شکایت آمیز لمبا سانس لے کر باہر صحن میں نکلیں۔ "سلام!" دونوں پارٹیوں نے ایک ساتھ کہا — ہر ایک فرد نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہ اس کی آواز سب سے کم سنائی دے۔

"ہے ہے، مر گئے مارے گرمی کے!" سیما بہن نے آگرے والی پر پہلے ہی یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس کا مزاج بھی شہر والیوں کا سا ہے اور وہ قصبے کے دالانوں کی قطعاً عادی نہیں ہے۔ اس کا ارادہ تو اس سے بھی آگے بڑھ کر پنکھا مانگنے کا تھا، مگر بوا فاطمہ نے شفیقہ کے پاس پہنچ کر اس کی کمر تھپکنی شروع کر دی، اور پوچھا: "بڑے دن لگائے بیٹی، اچھی تو ہے؟"

"جی!" شفیقہ نے بات کاٹنے کے لئے کہا: "آئیے، بیٹھئے۔ ادھر آ جائیے، اس پلنگ پر۔ اس پلنگ پر تو...." مگر اس نے جملہ نا تمام ہی چھوڑ دیا۔

اس دوران میں بوا فاطمہ خوب دیکھ بھال کر اطمینان کر چکی تھیں کہ بات بڑے

پائنچوں کے ریشمی پجامے اور بالیوں کے بجائے بُندوں تک ہی پہونچی ہے۔ زینت کا بھی ڈر ختم ہوگیا، اور اس نے اپنے تنگ پائنچوں میں ٹانگوں کے پٹھے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ سپاہی کو ایک حد تک مایوسی ہوئی، مگر اس خیال سے تسکین ضرور ہوئی کہ اسے خواہ مخواہ پچھتانا تو نہ پڑے گا۔ کلثوم نے بھی پیچھے سے جھانک کر دیکھا اور آگرے والی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی چاہی، مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد کسی اور وقت پر ملتوی کر دینا ہی بہتر سمجھا۔

اب بچے بھی آ پہونچے تھے، اور دونوں گھروں کے بچوں نے بھاگ بھاگ کر اور غل مچا مچا کر پس منظر کی موسیقی فراہم کرنا شروع کر دی تھی۔ سپاہی نے زیادہ دیر تکلف بنا رہنا بیکار سمجھا، اور سیدھے شفیقہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "بہن، میں تو تمہارے پاس بیٹھوں گی۔ میں تو برابر تو اسے کیسے بیاری تھی کہ دیکھ پاؤں کسی طرح انہیں!" اور پھر ساتھ ہی اپنے خصائص سے بھی آگاہ کر دیا تاکہ آگرے والی کو زیادہ دیر تک اس کے بارے میں غلط فہمی نہ رہے۔ "میری تو ایسی ہی عادت ہے، بہن،" ہنستے ہنستے کہا۔ "اب کیا کروں اپنی عادت کو۔ بُرا کبھی نہ ماننا۔ ارے کیا ہو گیا تیری بہنی کو!"

"ہاں، ہاں، بہن، بیٹھو" آگرے والی نے فوراً کہا تاکہ اسے بھی مُردہ دل نہ سمجھا جائے۔ "میں بھی یہ کہہ رہی تھی کہ کوئی باتیں واتیں کرنے والا ہی نہیں ملتا یہاں۔ آگرے میں تو ہر وقت آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔"

"وہاں تو بہت سی بہنیں بنی ہوں گی؟ فرخ آباد میں تو میری بھی ناکوں تھی۔ کھڑکی کھلی ہے ہمارے گھر میں۔ بس کھڑکی کھولی اور ادھر نکل گئی۔ پھر بائی سارے محلے میں۔ وہ آئے اور جگہ بدل گئے۔ بس ابھی گھر میں ہی نہیں دکھائی دیتی ہوں اٹھیں اور چل دیں۔"

آگرے والی نے نہ معلوم کیوں یہ محسوس کیا کہ زیادہ سہیلیاں رکھنا کوئی مبتذل سی بات ہے۔ "ہاں... بہت سی تو کیا، دو ہیں جن سے ذرا زیادہ میل جول ہے۔ ایک تو ہیں

آصف کی اماں۔ وہ بھی" اُس نے سپاہی کا دل رکھنے کے لئے کہا "بالکل تمہاری ہی سی ہیں بہن۔ بہت ہنستی ہیں۔ جب ہنسنے پہ آتی ہیں تو بس ہنسے چلی جاتی ہیں۔ فوج کے دفتر میں ہیں وہ۔ اور ایک ہیں نسیمہ کی اماں، وہ بہن بنی ہوئی ہیں خالہ کہلواتی ہیں وہ اپنی بیٹی سے سمجھے۔ کوئی آٹھ سال کی ہو اُن کی بیٹی، تیسری میں پڑھتی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے۔ ہے تو اتنی سی مگر باتیں بالکل بڑوں کی سی کرتی ہے۔"

"اسکول جاتی ہو گی پڑھنے؟" سپاہی نے اپنے شبہ کی تصدیق کرنے کیلئے پوچھا۔

بوا فاطمہ نے بھی اس سلسلہ میں کچھ پوچھنا چاہا، مگر اُسے اپنے سے بالاتر یا قبل از وقت سمجھکر چھوڑ دیا۔ کلثوم نے بھی فوراً ایک چوڑی سی سڑک بنائی جس کے دونوں طرف مبہم سی دکانیں تھیں، اور جہاں انجان شکلوں کی کالی اور بھاری گاڑیاں بغیر گھوڑوں اور پہیوں کے اُڑتی ہوئی آ جا رہی تھیں؛ اور وہ آٹھ سال کی نسیمہ کو اپنی ہری اوڑھنی سنبھالتے ہوئے بغل میں بستہ دبائے اسکول جاتے دیکھنے لگی۔ مگر چونکہ وہ راستوں سے ناواقف تھی اس لئے اُسے نسیمہ کو چوراہے پر کھڑا چھوڑ دینا پڑا، اور وہ باوجود متعدد کوششوں کے اُسے آگے نہ بڑھا سکی۔

"ہاں اسکول ہی تو جاتی ہے" شفیقہ نے بتا دیا۔

"بڑے ٹھاٹھ سے جاتی ہو گی پڑھنے؟" سپاہی نے پوچھنے میں جلدی کی کہ کہیں گفتگو کسی اور طرف نہ بہک جائے۔

"ٹھاٹھ؟ نہیں، ٹھاٹھ کیا، اپنا ہی جیسے سیدھے سادے ہوتے ہیں"

"تو تو بیٹی آگرے میں رہ کے بالکل نہیں بدلی" بوا فاطمہ بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھیں، اب اُن سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا "بالکل ویسی ہی سیدھی سادی ہے جیسے سب ہوں ہیں"

"ہاں، بہن" سپاہنی کو بھی اس موضوع پر روشنی کی ضرورت تھی "تم کیوں ہو اِتنی سیدھی؟ تم کیوں نہیں کرتیں شہر والیوں کے سے فیشن؟"

"ہاں، فیشن؟ فیشن کیا! انہیں نہیں پسند، وہ تو کہتے ہیں کہ یہی اچھی ہے اپنا سیدھا سادی وضع۔ اور ویسے فیشن دیکھنے ہوں تو آ کر سے میں دیکھو۔ ایک ایک فیشن کرتی ہیں عورتیں جس رنگ کی قمیص ہو اُسی رنگ کی شلوار ہو۔ سوٹ کہتے ہیں اسے ۔۔۔ ہاں، سوٹ۔ اور پھر ایک ہاتھ میں تو ایک چوڑی، اور دوسرے میں پانچ پانچ چھ چھ۔"

"اے سچ؟" اور جب شفیقہ نے یقین دلایا کہ ہاں واقعی ایسا ہی ہو تو سپاہنی اور لہکیں "اے ہائے! سن رہی ہو بوا؟"

"بس تو ہی سن" بوا نے فیشن پرستی کے الزام سے بچنے کے لئے کہا "تجھے ہی ہے شوق ایسی باتوں کا، مری جاوے ہے اونچی ایڑی کے جوتے پہ۔ کیا اچھا لگے ہے تجھے؟ مجھ سے تو نہ چلا جائے۔ دوپہر کو دیکھو اس کے تو تماشے۔ کبھی شیشہ لے کے ٹیڑھی مانگ بنائیگی کبھی ڈوپٹے کی ساڑھی باندھے گی۔ کبھی مٹک مٹک کے گائے گی: اب تو بڑھیین بھی کنگھا لگانے لگیں۔ اور ذرا انگریزی سنو اس سے بلوا کے۔"

سپاہنی نے آتے ہی اپنی جو تعریف پیش کی تھی اس کے صحیح ہونے کے ثبوت دینے کی وہ ابتک کئی دفعہ کوشش کر چکی تھی، مگر جب بوا فاطمہ نے شہادت دینی شروع کر دی تو اُس نے اُن کے بیان کے اثر کو مکمل کرنے کے لئے کئی قہقہے لگائے "تم تو یہاں پڑی ہو، بوا، تمہیں کیا خبر دُنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ جو باہر نکلو تو پتہ چلے۔"

"ہاں!" گھر والی نے تال دی۔

"ہاں" بوا فاطمہ نے بھی مرعوب نہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ دیا۔

"ہوں!" سپاہنی نے زیادہ پُرزور انداز میں کہا۔

فیشن کے ذکر پر شروع شروع میں تو کلثوم بھی سیدھی ہو گئی تھی اور پلکوں کو آنکھوں کے

نیچے کی ہڈی پر جلدی جلدی گرتے محسوس کیا تھا۔ مگر جلدی ہی اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ اُن صورتوں میں سے کسی نہ کسی کو دیکھ لینے کی کوشش کرنے لگی جو کٹی کٹائی شکلوں میں آدھی تہائی اُس کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ جلدی ہی اُن صورتوں کی جگہ کالی بھوری اور بادامی پٹیوں نے لے لی، اور کبھی تو اُسے اپنے کندھے چوڑے معلوم ہونے لگے اور کبھی کمر۔

"تو پھر سناؤ بہن اور کچھ باتیں۔" سپاہن نے خاموشی توڑی، اور احتیاطاً یہ بھی کہہ دیا "اور کیا کیا فیشن ہیں؟"

"اور کیا کیا فیشن ہیں؟ سینکڑوں ہیں، بہن، یہاں تو معلوم نہیں ہوتا، باہر نکلو تو پتہ چلے۔"

موضوع کا یہ نیا پہلو سپاہن کو بہت پسند آیا۔ "ہاں، بہن، تم نے بہت ہی ٹھیک بات کہی ہے یہ۔ باہر نکلو تو پتہ چلے، یہاں آ کے تو ایسا ہو گیا جیسے ماں کے پیٹ میں بیٹھ گئے۔ نہ ریڈیو ہے یہاں اور نہ کچھ۔ اب وہاں تھے تو سنتے ہی رہیں تھے لڑائی کی باتیں کہ آج اتنے مارے گئے، آج یوں ہوا، آج یوں ہوا۔"

تھوڑی ہی دیر سوچنے کے بعد سپاہن کو آگرے والی سے باتیں سننے کا ایک مزیدار نسخہ ہاتھ آ گیا۔ "ایک دفعہ اخبار میں لکھا وا آیا تھا کہ ایک اسکول کی لڑکی ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں کہوں ہوں بہن کہ کیسے مل گئے ہونگے دونوں۔"

"تمہیں نہیں معلوم؟" آگرے والی نے وضاحت کی۔ "ایک ساتھ پڑھتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں تو کالجوں میں۔ وہ آصف کی اماں جو ہیں اُن کا بڑا لڑکا پڑھتا ہے کالج میں۔ وہ بتایا کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں سب۔ وہ آصف کی اماں سنا رہی تھیں کہ اُن کے بھائی کے بیٹے نے کالج میں ایک لڑکی سے طے کر لیا تھا کہ تم سے کروں گا شادی۔ جب اُس کے باپ شادی کرنے لگے تو اُس نے

انکار کر دیا کہ "میں نہیں کرتا ہوں شادی" پھر اُسنے اُسی لڑکی سے کی شادی۔ باپ بھی مجبور ہو گئے۔ کیا کرتے بیچارے۔"

"وہ اچھے ماں باپ ہونگے، بھیّا"، بُوا فاطمہ نے غور کرنے کے بعد فیصلہ صادر کیا۔ "جو اپنی بیٹیوں کو بھیج دیتے ہونگے اس طرح پڑھنے۔"

"باہر نکلو تو پتہ چلے،" سپاہی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "ہاں!"

"ہاں،" اب آگرے والی میں بھی گرمی آ گئی تھی۔ "اجی کالج کی لڑکیوں کے دیکھو فیشن۔ ایک دفعہ ہم رات کو گئے تھے تاج محل دیکھنے۔ چاندنی میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے تاج محل، بہت آدمی جاتے ہیں چاندنی راتوں میں۔ تانگے پہ تانگے دیکھ لو جاتے وے۔ بہت دن سے کہہ رہی تھی کہ چلو چلو، ہمیں بھی دکھا لاؤ چاندنی رات میں تاج محل۔ مگر ٹلتا ہی رہا ہر دفعہ۔ تو اُس دن کالج کے لڑکے بھی آئے تھے تاج محل دیکھنے جس دن ہم گئے تھے۔ ہماری پڑوسن بھی گئی تھیں ہمارے ساتھ۔ وہ بھی بہت دن سے ——"

"ذرا سننا،" شیخ جی نے دروازے پر سے پکارا۔ "فرش ورش بچھ گیا؟"

مگر جب اُن کی بیوی نے اطلاع دی کہ ابھی تو وہ برتن ہی سنگوا رہی تھیں تو اُنہوں نے غصّے میں دروازے کی زنجیر ہاتھ سے چھوڑ دی۔ "کبھی ٹھیک رہیے! کب بچھے گا فرش؟ رات کے بارہ بجے؟ یہاں پڑھنے والے بھی آ گئے۔ اب بچھاتی ہو فرش یا کہہ دوں کہ آج نہیں ہوتی میلاد ویلاد کچھ؟" اور واقعی اُنہوں نے پکار کر کہہ بھی دیا۔ مگر جب اُن کی بیوی نے یقین دلایا کہ دیر نہ لگے گی تو وہ مان گئے، بلکہ ہنس پڑے اور واپس چلے گئے۔

سپاہی کی تجویز پر دونوں گھروں کے بچّوں کو لگا دیا گیا کہ وہ رسّی باندھیں، چادروں اور دریوں کے پردے لٹکائیں، فرش بچھائیں، چوکیاں لا کر رکھیں، بڑی لالٹین جلائیں۔ جب شیخ جی کی بیوی کی مدد سے وہ بچّوں کو کام کے متعلق مفصّل ہدایات دے چکی تو وہ

فوراً شفیقہ کی طرف مڑی، "ہاں بہن، تو پھر کیا ہوا؟ تم سنا جو رہی تھیں قصّہ؟"

"ہاں تو پھر یہ ہوا کہ..." آگرے والی نے بچّوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "غُل تو مچ رہا ہے، کیا کروں باتیں! کان پڑی آواز تو سنائی نہیں دیتی۔"

"ہونے بھی دو بہن غُل" سپاہنی اپنے جوش میں ایسے بہانوں کو کب خاطر میں لانے والی تھی۔ "تم سناؤ۔"

"ہاں.... تو اُس دن کالج کے لڑکے بھی آئے تھے۔ مجھے تو پڑوسن نے دکھایا کہ دیکھو تو بہن، کیسے پھر رہی ہیں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ۔ ایک ٹھٹے لگ رہے تھے۔ ایسے باتیں ہو رہی تھیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ ایک اُچھل کود! بھاگ کے یہاں بھاگ کے وہاں۔ کوئی تو ساڑھی باندھے وے، سر کھلا ہوا، پلّا چلا جا رہا ہے زمین میں جھاڑو دیتا وا۔ کسی بات کا ہوش ہی نہیں۔ اور کوئی نِکر پہنے وے.... ہاں نِکر، یہی جو گھٹنوں تک کا ہوتا ہے۔ ٹانگیں بالکل ننگی۔ آدھی آدھی باہنوں کی قمیصیں۔ اور جو ساڑھی پہنے وے تھیں باہیں اُنکی بھی کھلی ہوئی تھیں کندھوں تک۔"

"اور ڈوپٹہ دوپٹہ کچھ نہیں، وہ جو نِکر پہنے وے تھیں؟" بُوا فاطمہ نے پوچھا۔

"نہیں، کچھ نہیں، بس نِکر اور کھلے گلے کی قمیص، آدھی باہنوں کی۔"

"اور وہ.... وہ سب.... ہیں؟" یہ پوچھتے ہوئے سپاہنی کی گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"سب... سب" آگرے والی نے اس سوال میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

بُوا فاطمہ تو خیر ہکّا بکّا ہو کر رہ گئیں، مگر سپاہنی کو اپنے پیٹ میں سانس زیادہ بھاری معلوم ہوا، اور دونوں کن پٹیاں سرسرانے لگیں۔ وہ ایک روشن، واضح اور معیّن تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگی، مگر اُس جگہ جگہ سے جھولے ہوئے سفید کپڑے پر نہ معلوم

ننگی ٹانگیں کیوں جھولے چلی جارہی تھیں۔ کلثوم کے اندر بھی دو ایک پتیاں جلد جلد ہلیں مگر اُس نے اپنے چہرے سے اُس کے سب آثار مٹا ڈالے، اور وہ ہوا کو سونگھ سونگھ کر دیکھنے لگی کہ اُس میں اس وقت کیسی خوشبو آرہی ہے۔

سپاہنی کے جسم میں لہریں اُٹھ رہی تھیں جو اپنی اصل کے لحاظ سے تو ہنسی نہ تھیں، مگر حلق تک آکر وہ مسکراہٹ کی شکل میں ظاہر ہونا چاہتی تھیں، اور وہ اُنہیں چپ چاپ چہرے کی ہڈیوں میں جذب کر لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی اُن لڑکیوں کی راہیں دکھائی دے رہی تھیں، مگر لفظ اُبھرتے اُبھرتے پھر ڈوب جاتے تھے۔ وہ ابھی یہ سوال کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی تھی کہ شیخ جی نے پکار کر اطلاع دی کہ پڑھنے والے اندر آرہے ہیں۔

اوس کے ساتھ خاموشی گر رہی تھی اور ہر چیز پر چپکی جاتی تھی۔ یوں ہونے کو تو میلاد پڑھنے والوں کے گلے کافی بلند تھے، مگر معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی آوازیں فضا میں اُٹھ جاتی ہیں اور اوپر کی خاموشی کو نیچے دھکیل دیتی ہیں۔ صرف شروع شروع میں سپاہنی نے ایک قہقہہ لگایا تھا، کیونکہ حافظ جی بیان پڑھتے ہوئے اپنی آواز میں سوز و ساز پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر الف ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ تو زبر بھی عین بن جاتا تھا، اور اُن کا بوڑھا اور بھرّایا ہوا گلا لفظوں کو پچکا پچکا کر لمبوترا بنائے دے رہا تھا۔ اس کے بعد سپاہنی چپ ہوگئی تھی، اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بُوا فاطمہ کی تنبیہ کو مان لیا تھا، بلکہ خود اس کا جسم کچھ سست پڑ گیا تھا۔ اب تو ایسی خاموشی چھائی تھی کہ وہ اپنے اندر خون کی سنسناہٹ اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ صرف چھالیا کاٹنے کی آواز اُنہیں ایک لمحے کے لئے خارجی دُنیا میں کھینچ لاتی تھی، مگر "کٹ" کے ختم ہوتے ہی وہ بہت تیزی سے واپس ہو جاتی تھیں، جیسے کھینچی ہوئی ربڑ کا سرا چھوڑ دیا جائے۔ کلثوم کی ہم آہنگی میں

تو یہ "کٹ" بھی مکمل نہ ہو رہی تھی۔ وہ یہ ارادہ کر کے بیٹھی تھی کہ بہت دلچسپی سے مولود سُنیگی۔ ایک دو دفعہ تو ضرور ایسا ہوا کہ کسی مصرعے کے ٹکڑے نے اُس کے اندر بے چینی سے کروٹیں لیں اور اُس کی کلائیوں میں خون بھر بھر آیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اُسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ وہ آنکھیں جھپک رہی ہے اور پہلو بدل رہی ہے۔ اُس کا خیال چپکے سے کھسک گیا تھا، اور سَرگشت کرتا پھر رہا تھا۔ کبھی تو اُسے ایسے چہرے، نیم کے پیڑ، دیواریں اور چولھے نظر آتے تھے جو جانے بوجھے تھے، مگر کبھی وہ ایسے طبقات پر سے گزرتا تھا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور گہرائی ہی گہرائی، اور یہ اندھیرا کچھ ایسا سہاؤنا اور رسیلا تھا کہ وہ رُک کر منڈلانے لگتا تھا، اور بار بار سر جھکا کر اس میں غرق کر دیتا تھا۔ بوا فاطمہ نے اپنے خون تک کو وضو کرا رکھی تھی جس سے وہ بہت سُست ہو گیا تھا۔ اُن کے خیالات آ کر سینے میں جمع ہو گئے تھے اور بہت کلبلا رہے تھے، مگر انہوں نے سب کی ٹانگ میں رسّی باندھ رکھی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو یقین دلا دیتی تھیں کہ اُن کی توجہ صرف "حضور کے بیان" کی طرف ہے۔ سیاہنی اِس فرصت کے وقت فرّخ آباد گھومنے چلی گئی تھی، مگر کالج کی لڑکیوں کی رانوں کا خیال، جو کبھی تو سرخ معلوم ہوتی تھیں اور کبھی سفید۔ بار بار اُس کے اندر چمک پیدا کر رہا تھا۔

اِس تقدّس کی فضا میں سیاہنی کا دم گھُٹنے لگا تھا، اس لیے اُس نے چادر کو تھوڑا سا کھول کر باہر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اوروں نے دیکھا تو وہ بھی کھسکنے لگیں اور اُس کے اوپر سے جھانکنے لگیں۔ سیاہنی کی نگاہیں سامعین کے سروں پر سے تیرتی ہوئی تخت پر پہونچ گئیں، چینی کے رنگین گلدان پر کھریں، تھوڑی دیر حافظ جی کی لمبی ڈاڑھی سے کھیلیں، اور پھر پڑھنے والوں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

"یہ کون ہے؟" سیاہنی نے ہٹتے ہوئے پوچھا "یہ چکن کی ٹوپی اوڑھے ہے، لڑکا سا؟"

"یہ؟ یہ رشید ہے" کلثوم نے جھانک کر دیکھا اور بتایا "میرے ساتھ تھا یہ مدرسے میں۔ آٹھواں سپارہ تھا اس کا جب"

"ہے کس کا یہ؟" سپاہی نے دوبارہ پردے سے آنکھ لگاتے ہوئے کہا "بڑا گورا ہے!"

کلثوم فوراً نیچے بیٹھ گئی اور دوپٹے سے ناک سہلانے لگی۔ وہ سب سے کہہ دینا چاہتی تھی کہ اس زمانے میں تو رشید بہت گندا رہتا تھا، اور اُسکے کپڑوں میں جوئیں بھری رہتی تھیں۔ مگر اُس کا سانس پھول گیا تھا، اور گال بوجھل معلوم ہو رہے تھے۔

پھر ربڑ کھینچی اور چھوڑی جانے لگی۔

ہاں، جب سلام پڑھنے کے دوران میں لوگ اس مصرعے ("نور سے معمور سینہ") پر پہونچے تو کلثوم کا بدن جسے اس نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا تھا، پھر گرم ہو گیا، اور اُسکے سر میں فوارے چھوٹنے لگے۔ "مہبطِ وحیٔ سکینہ" سے بوا فاطمہ اور سپاہی دونوں کو اپلوں والی سکینہ یاد آ گئی۔ بوا فاطمہ تو یہ سوچ رہی تھیں کہ اب سکینہ نے پیسے کے چھ کی بجائے پانچ کر دیے ہیں اور انہیں لوٹ رہی ہے، اور ساتھ ہی اُسکے اُپلے کتنے ہلکے ہو گئے ہیں۔ مگر سپاہی کو اس پر ہنسی آ رہی تھی کہ وہ اپنی بہو کو لڑائی میں کیسی کیسی گالیاں دیتی ہے۔

***

جب اسمٰعیل اور رشید اُستاد سے رخصت ہو کر گلی میں مڑے تو اسمٰعیل نے قریب ہوتے ہوئے کہا "تو نے دیکھا تھا اسے رشید؟ کون تھی جو پردے میں سے جھانک رہی تھی؟ مجھے تو آنکھ ہی دکھائی دی بس... آنکھ تو اچھی تھی یار!... شیخ جی کے بیٹی تو نا تھی؟ ہے کوئی شیخ جی کے بیٹی اتنی بڑی؟"

***

"ادبِ لطیف" ستمبر ۱۹۴۱ء

۲۴ اگست ۱۹۴۱ء

چائے کی پیالی

حالانکہ وہ یہ دیکھنا تو چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کون سی نئی دکانیں کھلی ہیں، کون کون سے پُرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں، وہ گورا گورا سُنار کا لڑکا اب بھی دُکان پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں، سِنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بِک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا، بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے؟ وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی، اور خود کو بڑا ہلکا اور سُبک محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی بڑی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اُس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، اور سیٹ پر خوب کھل کر بیٹھ گئی۔ بے شمار دوڑتی ہوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں ——— ہیچ مقدار اور ناچیز، بلکہ مضحکہ خیز لکیریں ——— اور وہ بلندی پر بیٹھی اُن کی سراسیمگی سے لطف اُٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گِن گِن کر قدم رکھتا، اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دکاندار اُسے دیکھ کر چونک سے پڑتے، اُن کی نگاہیں دُور تک اُس کا پیچھا کرتیں، اور وہ سوچتے "اوہ، اب یہ

کتنی شاندار ہو گئی ہے، اس کے بال کیسے چمکیلے ہیں، اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!" مگر اُن کے دل میں تجسّس اور تحیّر کبھی نہ پیدا ہوتا، اور نہ اُن کی آنکھوں کی چمک یہ پوچھتی، "کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے۔" اس کے برخلاف ان کا انداز تو سرپرستانہ ہوتا، اور اُن کے خیالات کچھ اس قسم کے ہوتے، "بھئی ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ نکالا ہے! شاباش، شاباش!" جیسے اُس کے رنگ روپ نکالنے میں اُن کی کوششوں کو بھی دخل ہو، اور وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پُرتجمّل چیز کے حصول پر مبارک باد دے رہے ہوں۔ اُن کی ہلکی زیرِ لب مسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں، "کہو، اچھی تو رہیں، بہت دن میں دکھائی دی ہو!" یا پھر جیسے اُنہیں یہ توقع ہو کہ وہ اُن کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پروا نہ کرتے کہ اب وہ یہاں کے "مشن گرلز اسکول" میں نہیں پڑھتی جس پر دھندلے اُردو حرفوں میں "لڑکیوں کا مدرسہ" لکھا رہتا ہے، بلکہ ایلی نگر کے "کرسچین گرلز انسٹیٹیوٹ" کی طالب علم ہے۔ اور نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اُسے ہلائے ڈال رہے ہیں۔ وہ تو بس زمین پر پڑے پڑے گستاخانہ کہتے رہتے، "ارے، اب تم سو کیا وہ، تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو، نہ جانے کتنی بار تمہارے ٹھوکریں لگی ہیں۔ اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آگئی تھی۔" بس بالکل اس بسکٹ بنانے والے کی طرح جو اُسے دیکھ کر اپنے کالے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا، "اوہ، یہ تو وہی ہے عیسائی کی ––" اور دُکانوں کے چھجّوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اُسے گھیر لیتے، کھسکتے، رینگتے، گھسٹتے، اُس کے پیچھے چلے آتے، اُس کے قدموں سے لپٹے جاتے، اُس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے، بے کسی کے لہجے میں، بھنچے ہوئے گلے سے کہتے، جیسے دم توڑ رہے ہوں، "بس ایک لمحہ ٹھہر جاؤ.... بس ایک نظر... اپنے پُرانے سائیوں

کی طرف" اور اُن کی یہ عاجزی اور منّت سماجت بیکار نہ جاتی۔ اُس کے ڈھیلا پڑتے ہی وہ اُس کے دل میں گھس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کر سو جاتے، یہاں تک کہ اُس کا سر ڈھلک جاتا، سانس ہلکا مگر بھاری پتھر ہو جاتا، اور اس پر مسلسل مندی طاری ہو جاتی جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی۔ لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت نے اُسے ان تمام پیچی ہوئی، چھپاتی اُلجھنوں اور جھنجھٹوں سے بچا لیا تھا۔ وہ اب کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی؛ اُس کی شخصیت پگھل کر دوسری چیزوں میں نہیں مل جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی، صرف اور محض۔۔۔ مس ڈولی روبنسن ۔۔۔ بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک، سفید ڈوپٹہ اور اُونچی ایڑی کا کالا جوتا پہنے ہوئے، سفید چکنی پنڈلیاں تانگے پر مضبوطی سے جمی ہوئی، کہنی تکیے پر، سنہرے بُندے دونوں طرف جھول جھول کر چمکتے ہوئے، احتیاط سے بنے ہوئے کالے بال، اور پاؤڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اُسے "ڈولی" کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر مار کر کہتی: "کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی؟ مگر، معاف کیجئے گا، میں تو مس روبنسن ہوں، کرسچین گرلز انسٹیٹیوٹ ایلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم۔ اور میں موجود تو ہوں آپ کے سامنے۔ دیکھ لیجئے، بھلا میں ڈولی ہو سکتی ہوں؟" اگر وہ محض مس روبنسن بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ، کوئی سیڑھی کوئی دہلیز، کوئی گڑھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کئے چلا جاتا، "مگر تھمو تو ہم تو تمہیں مدّتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں۔" شہر کے باہر باہر جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خوددار، پُر تمکنت اور بے نیاز واقع ہوئی تھیں، وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اُس پر بڑی مہربان ہوتیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں: "اچھا، تو آپ کا نام مس روبنسن ہے! جی، بہت خوب۔" ان کوٹھیوں کے مطالبہ سے تو وہ یوں آزاد ہو گئی؛ مگر دوپہر کا سورج تو عملی طور سے اُس کی مدد کر رہا تھا۔ ایک سخت گیر آقا کی طرح اُس نے اپنی نگاہِ گرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا

تھا، اور وہ سہم سہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی تھی کہ ان کا رنگ و روغن سب اڑ گیا تھا، اور ان کے دل سے خود نمائی کے ولولے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جلی بھنی کھڑی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں، "چاہے دیکھو، چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ، جہنم میں جاؤ!" ان کی چڑچڑاہٹ اور کوسنے بھی کتنے مضحکہ خیز تھے، تم رہتے ہم چھوٹے! تانگے کے تختے پر اس کے پیر کا دباؤ اسے برابر یاد دلاتے جا رہا تھا کہ اسے ان گرد و پیش کی چیزوں پر حاوی ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہو کہ وہ مس روبنسن ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں، اور آستینوں سے باہر نکلے ہوئے، اور پھر یہ بھی کچھ کم نہیں کہ وہ ایک نگر سے آ رہی ہے جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہوئی کوٹھیاں ہیں، شاندار اسٹیشن، اور فریج ناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اس کے لئے جاذب نظر ہیں۔ اب کیا وہ آنکھیں بند کر لے؟ اگر وہ رشک و حسد سے پھنکی جا رہی ہو تو خیر کر بھی لے۔

اب تک تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی آئی تھی مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اسے اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں، اناج کی گاڑیوں، اکوں، گھاس والیوں، کھچڑی مونچھوں والے کسانوں، گڑ کی جلیبیوں پر بھنکتے ہوئے مکھیوں، اور لوہے کی دکانوں کی دوسرے شور و غل سے اوپر سنائی دینے والی ٹھنا ٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب یا مضحکہ خیز نہیں ——— محض مہمل اور ناقابلِ توجہ۔ جیسے مسٹر تربوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی ——— یا، رعایتاً، ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے ایک اکّے میں دو مرد، چار عورتیں، پانچ بچے، یا گاڑی میں لگا ہوا پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز۔ ہر چیز کی ہیئت معیّن تھی، واضح، روشن، قطعی، پوری طرح اپنی لکیروں کے درمیان ——— نہ کہیں

نسے رنگ بہا ہوا، نہ کہیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی فردیت تھی ـــــ علیحدہ، ٹھوس، مستقل چیزیں اپنی جگہ پر مطمئن، مرنجان مرنج نہ تو وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصّہ و بالینا چاہتی تھیں اور نہ گڑگڑا کر التجائیں کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر مدغم کر لے۔ بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا، اور اُسے اوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور پھر ان سب نے ایک دوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتہ کر لیا تھا، اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوشش کر رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی ـــــ ایلی نگر کی مس روبنسن بھی۔ مس روبنسن کے لئے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آ کر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی، مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بیزار نہیں تھی۔ اُس پر تو ایک مطمئن تعطّل کی کیفیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور اڈّے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت رُوح افزا نہ تھا، اپنا یہی ایک آدھ پان اور سوڈا واٹر کی دُکان تھی، یا پھر درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے، ایک دوسرے سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ مگر پھر بھی اُسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کا حسّیاتی جمود ختم ہو گیا تھا، اور اب وہ کم سے کم اپنا ردِ عمل تو معیّن کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اسی طرح دبا رہا تھا، تکیہ پھر اُس کی کہنی کے نیچے واپس آ گیا تھا اور خود تانگہ بھی پہلے سے اونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ سامنے والی دُکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اُس کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ وہ اِس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ نائی کے لڑکے جو اُسے کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے، اُس کی آنکھوں اور رُخساروں کو پھڑکا سکتے ہیں، اُسکے ہونٹوں

کو مائل بہ تبسم کر سکتے ہیں، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے —— اتنا بھی نہیں جتنا سینما کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹریس کا، کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دیکر کم سے کم ایکٹریس کے گالوں کے گڑھے پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں۔ مگر مس روبنسن اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں ان کے خیالوں تک کی پہونچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ اڈّے پر پہونچتے ہی وہ گھڑگھڑاتے ہوئے اِکّوں، لاریوں کی قطاروں، موٹر کے ہارن کی آوازوں، اِکّے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلّا ومصفّا اور پُر سکون فضا میں رہنے کے بعد یہ شور وغوغا، یہ ہنگامۂ رستاخیز، اور یہ گرد کے بادل اُسے ناگوار گزر رہے ہوں اور اُس نے دو ایک بار "فوہ .... فوہ!" کرنے کے بعد مُنہ پر رومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں، اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ ہر روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری جکھیڑے جاتی ہے، اور لال رنگ کی ٹیکم پور، اور وہ ٹوٹی ہوئی چھتری والا اکّہ بہت سست چلتا ہے، اور وہ ڈاڑھی والا آدمی جنگی کا منشی ہے۔ کوئی بھی چیز غیر مانوس نہ تھی۔ بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد وپیش کی ساری چیزیں بڑے فخر ومباہات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھیں۔ مگر، نہ جانے کیوں، وہ مس روبنسن کی شخصیت کو پھیلا کر اس ماحول پر مسلّط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اور نہ اُس سے یہ ہوتا تھا کہ ڈولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دیدے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹتی تھی، سُکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی جیسے کوئی وار روک رہی ہو۔ کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی رہے، چلتا ہی جائے، اور کبھی یہ کہ بہت سے اِکّے سامنے ہو جائیں اور تانگہ رُکا کھڑا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اُس کی حالت اب بالکل اُس نوخیز

لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپاتی پھرے، اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جاتے تو گھنٹوں ہونٹ کاٹتی رہے۔ وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اُس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی، اور اُس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی، کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اُسی کی تو اُسے ذرا ذرا سی تفصیل یاد تھی۔ جب اُسکی اپنی لاری کے بجاتے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اُسے خوشی ہوتی تھی کہ چلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اُس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آکر کہا "کہاں جانا ہے؟ ٹیکم پور؟" تو اُسے ایک گونہ تکلیف ہوئی —— اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اُسے پہچانتا نہ ہو۔ اُس نے بڑی گلوگرفتہ آواز سے جواب دیا "ہاں .... نہیں۔ سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں" ایجنٹ نے ایک اِکّے کی طرف جاتے ہوتے کہا، "وہ بھورے رنگ کی .... بس تیار ہے۔"

تانگہ رُکنے سے پہلے ہی اُس نے تانگے والے کو پیسے پکڑا دیئے، اور جلدی سے نیچے کود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے، اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیئرنگ وھیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈولی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا، مگر ہونٹوں تک آتے آتے اُس کے لفظ بدل گئے۔ اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا، جیسے اُسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویّہ ایسا تملّق آمیز نہ تھا، مگر اُس کی آواز سنتے ہی ڈولی کو ایسا معلوم ہوا جیسے سرد، سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان یکایک ایک کمرے نے آکر اُسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اُس کے لئے اسمِ اعظم کی وہ تختی بن گیا

تھا جو اُسے ہر قسم کے آسیبوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟... یہی کوئی ڈھائی تین بجے"

"تو کے بجے؟... ٹھیک"

"ہاں... بس تین بجے چل پڑے گی لاری"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں متذبذب تھی۔ وہ ایک لمحے دیکھنے کے بعد اُس نے پوچھا: "اور اب کیا بجا ہوگا؟"

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی، اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا: "کوئی ایک ہوگا"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلّی بخش نہ تھا، مگر ڈولی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا: "اچھا تو ــــ"

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اُس کی مردانگی غالب آ چکی تھی اور اُسے یہ بھی خیال آ گیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دعا رہی ہے۔ اس لئے وہ اُٹھ بیٹھا اور کلینر کو دو تین آوازیں دیکر ڈولی کا سامان اوپر رکھ دینے کے لئے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد ہی مطمئن ہو گئی، مگر جگہ کا مسئلہ ابھی درپیش تھا۔ وہ باہر ہی سے کھڑی اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پاجامہ پہنے، پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی، اور اپنے پوپلے منہ سے پان چبا رہی تھی۔ اُس کے سامنے کی سیٹ پر ایک آدمی جو اُس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، بیٹھا ایک گٹھڑی کو ٹھیک سا کر رہا تھا۔ بیچ کے حصّے میں رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب نکر پہنے ہوئے اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی تھا جو گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اُس کے پاس رکھے تھے اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈولی

کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے، اور ادھر دھوپ اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے والی ہی تھی کہ ڈرائیور نے سر اُٹھا کر کہا" بیٹھو، اندر بیٹھو۔ بس اب چلنے ہے لاری"

گو "بیٹھو" ذرا چونکا دینے والی بات تھی، مگر اُس کی آواز سن کر ڈولی کے دل میں یہ اُمید پیدا ہو گئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اُس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لئے اُس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہاں.... اچھا.... کہاں بیٹھوں؟"

"یہاں آجاؤ، بیچ کی سیٹ پہ" ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

"ہاں.... لیکن" ڈولی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی" اگر آگے ——"

"آگے؟.... آگے تو جی آج دروغہ جی جارہے ہیں۔ آگے تو اُن کی جگہ ہے"

مگر جب ڈولی اُسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی، اور کانکھتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ "آگے بیٹھو ہو" اُس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا" بیٹھ جاؤ یہیں کیا وہ۔ ہمارے سے چاہے کوئی بیٹھے لیکن دروغہ جی جارہے ہیں آج"

ڈولی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے مورچے کے لئے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تُلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اُسے تکلیف دینے سے روک سکے، مگر وہ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ اس لئے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں، اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی منٹ تک رومال سے ہوا کرنے کے بعد اُسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اُس نے یکایک یہ دیکھا کہ لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں جن میں اُس کا چہرہ نظر آرہا ہے، تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری نگاہ نے حیرت کو

کسمساہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اُس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے اور گرد سے بھورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اُس کے چہرے کو تمتما دیا تھا، اور وہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خشک پپڑیوں نے اُس کے ہونٹوں کی سُرخی زائل کر دی تھی، اور اُس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھیں۔ اُس نے شرما کر گھبراتے ہوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا۔ زور زور سے چہرے کو رگڑا، اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھل کچھ گئے۔ آخر اُس نے جھنجلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی، اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ستاروں والی ہری ساڑھی، لمبے لمبے بُندے، پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی، سُرخ چہرہ، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اُسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لئے اُس کی نگاہیں آگے بڑھ گئیں، اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی قطار کی قطار کھڑی تھی مگر اُسے صرف اُن کے انجن اور مڈگارڈ نظر آ رہے تھے۔ سامنے دو اِکّے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، اور اپنے اپنے اِکّوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ دو ایک خوانچے والے، پانی پلانے والا اور چند کلینر جمع ہو گئے تھے اور آدھے ایک اِکّے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دُکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا ہوا سا بیٹھا تھا۔ وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمّت کر رہا تھا، اور اس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضہ کر رہے تھے۔ اُس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک اونچا سا ڈھیر تھا جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا، خشک اور بالکل سفید، دھوپ کی سختی کے باوجود مطمئن اور ساکن ـــــ بے نیاز، جیسے کوئی معمّر اور جہاں دیدہ رواقی فلسفی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اُٹھتا تھا، اور آہستہ آہستہ

اوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے ہوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اُڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دُور آگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچّی دیواریں اور چھپّر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچّہ درختوں سے باہر نکل آتا تھا، اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمّل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادّے کی شکل میں تبدیل ہو کر تفکّرانہ انداز میں اس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے ہوا سے اُڑتی ہوئی چادر کی طرح اُوپر اُٹھے ہوئے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا جیسے اُس کی رُوح اپنے جسم کو وہیں چھایا ہوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو، اور ایک ننھی سی ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کو خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی بہار کی شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چٹ چٹاتی پھر رہی ہو۔ ٹانگیں ملا کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر، سر کو کچھ تو اضمحلال اور کچھ جذبۂ تسلیم و رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہوئے، وہ بگولوں کے ساتھ اُوپر چڑھتی چلی گئی تھی جو اُسے فضا میں معلّق چھوڑ کر نیچے اُتر جاتے تھے، اور وہاں سے آسمان کی متخیّل نیلاہٹیں اُسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک آم کے پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچّی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی؛ اُس نے آم کے پتّوں کی تر و تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی، فضا کی طراوت اور خواب ناکی اُس کے جسم میں اُتر گئی تھی، اور وہ کچّی دیوار اُسے اپنی پُرانی ہمجولی معلوم ہونے لگی تھی۔

اسی لئے جب پیچھے دروازہ کھُلنے کی آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اُس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مُڑیں۔ ایک اسٹیشن پر دو تین عورتیں، بچّے اور کچھ مرد اُترے تھے، اور اب اُن کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا۔ ڈولی کو پیچھے پھر کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں پچھلے حصّے میں چند آدمی اور بیٹھ چکے تھے۔ اُن کے

قریب ہی نیچے چاٹ والا اپنا خوانچہ لیے بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی بچوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا تھا، اور اپنی ماؤں کو اوپر چڑھنے کی بھی اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لیے پٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں، اور اُن کے کلینر زور زور سے آوازیں لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں لے لیں۔ لاریوں کے چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور اُن کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے یکایک ڈولی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پٹرول کی دکان کے قریب بن رہا تھا اور جس کی طرف اُس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہاں خالی زمین پڑی تھی جہاں کتے اپنی کھلاڑیوں سے گرد اڑاتے رہتے تھے، اور کبھی کبھار کوئی خوانچے والا سستانے کے لیے آ بیٹھتا تھا۔ لیکن اب تو وہاں پاڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا، بس چھت پوری ہونے کی کسر تھی۔ مکان کے اندر اندھیرا سا تھا اور اُس کی زمین ابھی تک سیلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی، پُر کیف اور ذہن کو کُند کر دینے والی خُنکی تھی جو ڈولی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائے جا رہی تھی، اُس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو سُست کیے دے رہی تھی۔ داہنی طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو اُس کا چھوٹا بھائی فریڈی اُس کا بستر کریلے گا اُس کا ٹرنک کھولنے کو بیتاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ بوا اُس کے واسطے کیا لائی ہیں اور جب وہ کچھ نہ پاسکے گا تو بہت مایوس ہوگا۔ اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے آٹھ آنے اور سامان اُٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد بھی اُس کے پاس چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنس کو خط لکھنے کے لیے بھی سہی، تین آنے میں کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اتر کر پھلوں والے کے پاس گئی، اور ایک منٹ تک اُس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا: "سنترے کیا حساب دیے ہیں؟"

اُمیدوں سے بھرے ہوئے لہجے میں پھلوں والے نے کہا: "پانچ پانچ پیسے دے

رکھے ہیں، میم صاحب"

"پانچ پیسے کا ایک؟"

"ہاں، پانچ پانچ پیسے، بڑے میٹھے ہیں، میم صاحب۔ لو چکھ کے دیکھو"

"نہیں، نہیں، رہنے دو" اُس نے تین آنے کو پانچ پیسے سے تقسیم کرتے ہوئے کہا۔

"تین تین پیسے نہیں؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں، میم صاحب" پھل والے نے اپنی باطل اُمیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا" لو، کیلے لو۔ پانچ پیسے کے دو دیتے ہیں"

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اُس نے آدھی مایوس ہو کر پوچھا "کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"کم؟ اجی، تمہیں نہیں لینا دینا۔ لاؤ کیلا، میں چلوں" اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا" لو چودھری، چوس لو، رسیلے ہو رہے ہیں رسیلے"

یکایک اُس کے حلق میں ڈاٹ سی اڑ گئی، اور سانس لینے کی کوشش میں کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئیں، اُس کے شانے خود بخود کام کرنے والے مدافعتی آلات کی طرح نیچے جھک گئے، اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے۔ اُسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ کھڑی تھی دفعتاً بلند ہو گئی ہے، اور ساری دُنیا کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئی ہیں اُس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے، اور اُس نے تین آنے پھینکتے ہوئے کہا" بسکٹ"

"بسکٹ؟" یہ محض ایک لفظ بسکٹ والے کیلئے کسی قدر مبہم تھا۔ اُس نے پوچھا" ایک آنے درجن والے، کہ تین پیسے درجن والے؟"

"کوئی سے" ڈولی نے ہات بڑھاتے ہوتے جواب دیا۔ اُس نے بغیر کچھ کہے سُنے تین بنڈل ہاتھ میں پکڑ لئے، اور تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اپنی جگہ پر واپس چلی آئی۔ مگر بیٹھنے

کے بعد تو اُس کا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگنے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ دل تھوڑا سا نیچے کھسکتا معلوم ہوتا تھا؛ اُس کی چھاتیاں بڑی، بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں، اور اُن میں کوئی چیز اُبل رہی تھی، سنسنا رہی تھی، گول گول چکر لگا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا جیسے خشک کرنے کی کوشش میں اُس کا سانس بھاری اور دُشوار بن کر اُس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کئے دے رہا تھا۔ وہ جتنی نیچی ہو سکتی تھی ہو گئی، اور ڈوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ ڈوپٹے کے لمس میں تسکین تھی، دلاسا تھا، ہمدردی اور غمگساری تھی، شفقت اور محبت، اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور محافظت کرنے کا وعدہ۔ اُس کی کھال سے ڈوپٹہ کیا چھوا تھا آگ پر پانی پڑا تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا، اور چند ہی منٹ میں اُسکے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے بُخار کے بعد۔

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اُس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جماہیاں لینے سے بھی اُس کی تسکین نہ ہوئی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے، یا ٹانگوں کو خُوب تان کر پھیلا دے ـــــ لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا اُس کی ٹانگوں کے مان کا نہ تھا، اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ تھا کہ اُس کا ڈوپٹہ پھسل جاتا، اور بازو اُونچے اُٹھتے جہاں سب کی نظریں اُن پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اُس نے ڈرائیور کو پکار کر بُلایا، اور وقت پوچھا۔

"اب چلے ہے"! ڈرائیور نے کہا۔ "گھبراؤ کیوں ہو؟"

"مگر ویسے بجا کیا ہے؟"

"سوا دو بج رہے ہیں اب۔"

ابھی پورا پون گھنٹہ باقی تھا اور یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی رانیں پتھر ہوتی جا رہی تھیں۔

پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی، مگر اُسے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ لاری والوں کے قاعدے کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اُس نے کسی المیہ کی ہیروئن کی سی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا، اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی، اور پھر اندر جائے گی۔ فریڈی اُسے دیکھتے ہی "ڈولی بُوا، ڈولی بُوا!" چیختا دوڑے گا، اور آکر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا: "ڈولی بُوا کیا لائی ہو؟ دکھاؤ.... انگریزی مٹھائی لائی ہو؟.... تم کہہ گئی تھیں!" جب اُسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد بھی کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھن ٹھنانے لگے گا۔ وہ اُسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی، "اچھا، آنکھیں بند کرو، دیکھو، ہم تمہیں ایک چیز دیں!" فریڈی یقین نہیں کرے گا، اور بڑی دیر کی بحث کے بعد آنکھیں بند کرے گا۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا بنڈل دیدیگی، جسے دیکھ کر فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا، اور وہ اُسے گود میں اُٹھا کر خوب پیار کریگی۔ ــــ جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اُس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی، اور کہے گی: "ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے!" فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اُس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ اُسکے جسم میں رس اُترتا چلا جائے گا اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اُسکے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا، مگر وہ اُسے صاف نہیں کرے گی، بلکہ یوں ہی رہنے دے گی ــــ اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتے تو چلیں گے۔ گو اُس نے جلدی میں پورے تین آنے پھینک دئے تھے، مگر خیر ٹھیک ہے ــــ اب وہ برٹنس کو لفافہ کے بجائے کارڈ بھیجدیگی۔ چلتے ہوئے برٹنس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا چونکہ وہ وعدہ کر آئی ہے، اس لئے چھٹیوں بھر اُسے خط بھیجتی رہے گی ــــ لفافہ نہ سہی تو

کارڈ تو ضرور.... مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا جاتا ہے گا؟.... بہرحال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشن کے اشتہاروں کی ردّی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سُنا کر اناج لایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ اُن سے اناج لے لیا کرے گی، اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیجکر اُس کے پیسے منگوا لیا کرے گی۔ وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور خط بھیجے گی.... کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک ایک چارپائی پر لیٹی باتیں کرتی رہی تھیں یہاں تک کہ اُن کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں، اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات اُن کے سینے مل جاتے تھے۔ اُن کے تھوک نگلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونجتی تھی۔ دونوں کے بازو جل رہے تھے، مگر اُن کا مس کتنا راحت بخش تھا اُس کا جی چاہتا تھا کہ یہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں، مگر بغیر کسی خاص سبب کے اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر رہی ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں؛ اور پھر اس راحت کے احساس کی شدّت بھی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لئے اُسے بار بار بانہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔ اس رخصت کی رات برنس نے اپنے سارے راز جنہیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی، ایک ایک کر کے بتا دئے تھے۔ اُس نے سُنایا تھا کہ ایک دن جبکہ سارا اسکول مل کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اُس کے پیچھے بیٹھا تھا، برابر اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ برنس نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اُسکی طرف دیکھا تھا، اور اندھیرے میں اُس نے ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اُس لڑکے کا قصّہ تھا جو اُسے چھٹیوں میں ملا تھا جب وہ اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصّہ سُنانے سے پہلے اُس نے رکتی

ہوئی آواز میں کہا، "ذرا اور قریب کھسک آؤ"، برنس نے اپنا بازو مضبوطی سے اُس کے گرد ڈال لیا تھا، اور اُس کی کمر تھپ تھپاتی جاتی تھی۔ اُس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا، اور جسم سے لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اُس نے دیوی داس بتایا تھا جو اُس کے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا، اور بڑا گورا اور خوبصورت تھا، اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا۔ دیوی داس کی خوش مزاجی نے اُس کی مدافعت پر جلد قابو پالیا تھا۔ جب اُس کا بھائی اِدھر اُدھر ہوتا تو وہ اُسے گود میں بٹھالیتا تھا، اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا،" اور وہ برنس نے اپنی ٹھوڑی سے سینے کی طرف اشارہ کر کے لفظ چباتے ہوئے کہا تھا، "یہاں ہاتھ رکھے رہتا تھا۔" قصہ سُناتے سُناتے برنس نے رُک کر تکیے سے سر اُٹھا لیا تھا، اور چند لمحے اُس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا، "ڈولی، ہم پیار کر لیں تمہیں؟" اور اُس کی خاموشی کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اُس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے کے لئے اُس کے گالوں پر رکھ دیئے تھے۔ اُس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا اطمینان، بے فکری، اور محفوظ ہونے کا احساس حاصل ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کینگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر ——— قصے کے دوران میں اُس نے اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں سے دور رہیں مگر اُس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا جاتا تھا ——— اس کے روکنے کے باوجود اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں، اور بار بار چادروں سے منہ اور ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں ——— چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر اُن میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو ایسی گھٹن محسوس ہوتی تھی جیسے اُن کے بدن جڑے ہوئے ہوں ——— برنس کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی ——— برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اُداس رہی تھی، خصوصاً ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی۔ کھیت

جھاڑیاں، تار کے کھمبے، درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم کر اُفق کی طرف نکلے چلے جاتے تھے، گویا وہ اُسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اُس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اُس کے سینے کے بیچوں بیچ کوئی چیز ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی تھی، جو اندر اُترتی چلی جاتی تھی۔ اُس کا جی چاہا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے، اور نزع میں پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے کی طرح اپنا سینہ دیوار کے ٹھنڈے ٹھنڈے تختے سے لگا دے، اور ساری دُنیا سے غافل ہو جائے ——— جب وہ لال لال پُل آیا تھا تو اُسے ذرا ڈھارس بندھی تھی کہ اس نظارے سے اُس کی افسردگی دور ہو جائیگی۔ مگر اُن دیوؤں کی سی سُرخ ٹانگوں سے جو اُسے دریا کے نیلے نیلے، چمکتے ہوئے پانی کو اچھی طرح دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اُس دھڑ دھڑ اور گھڑ گھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوتی تھی کہ اگر پُل جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ مارے وحشت کے رو دیتی.... اُسے کچھ پتہ نہیں رہا تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی جولیا کی ہنستی ہوئی آواز، یا گریس کی چیخیں جیسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں، یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے کے لئے اُس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا ——— برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہونچ لی ہوگی، وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہوگی جو اُس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے.... برنس دھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اُتری ہوگی، اور اُس کے ہر سے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بول رہی ہوں گی.... اُس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اُتار لینے کے لئے کہا ہوگا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی......

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے جھٹ سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سر اور ہاتھ ہلا ہلا کے جھلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رُخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی، اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لئے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں "لو بھئی، چلی تو کسی طرح!"

"کچھ معلوم بھی ہے؟" ڈرائیور نے کلینر کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا۔ "پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں۔"

لاری کا انجن بھربھرانے لگا۔ ننھے ننھے چکر اس کے پیروں میں داخل ہوئے، اور گول گھومتے، ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے، اوپر چڑھتے چلے گئے، اور پنڈلیوں، رانوں، پیٹ، چھاتیوں، بغلوں، بازوؤں، کانوں، اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیئے تاکہ اس کے پیر اور جھن جھنانے لگیں۔ مگر ایک دفعہ چکروں کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پیٹ میں آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ پیٹ کے نچلے حصّے میں اٹک کر اودھم مچانے لگا، یہاں تک کہ ڈولی نے بجلی کی سرعت سے پیر کھینچ لئے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لئے۔ لاری آہستے ہلکے ہلکے جھکولے دیتی آگے بڑھی مگر وہ ابھی رینگ کر ہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رک گئی۔

"کیوں بھیّا؟" کسی نے پچھلے حصّے سے پکارا۔ "کیا اور بٹھا دے رہے ہو؟ یہاں پہلے ہی گھٹے جا رہے ہیں، مرے یار!"

مگر ڈرائیور نے اسے ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا اور اتر کر پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لئے کہا... پمپ کے اُجلے صاف شیشے میں نقرئی سیّال اٹھلا اٹھلا کر اور ٹھمک ٹھمک کر اوپر چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ جو چیز ڈولی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے تھے جو اُبلتے ہوئے شفّاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ پٹرول کی بُو کے باوجود اس نے سر نہیں پھیرا تھا، اور تیل کو چڑھتے اترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی، اور اس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی جو اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اِکّوں کو گرد کے بادلوں میں چھپاتی پھر روانہ ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ کلچ پر پہونچتا تھا، ڈولی سانس کو حلق ہی

میں روک کر کسی گمنام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو جو اس وقت انتظار، ارتعاش کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا، ہوا پر جس کی ہستی اُسے ٹھوس اور مرئی معلوم ہو رہی تھی آگے جھکا دیتی تھی ——— ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔ اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اُس کی ران میں گھس آتی تھی جیسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے اُن کے ڈھیلے پڑتے ہی اُسکی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی۔

سعد آباد کی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رفتار یکساں سی پڑ گئی، اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اِدھر سے اُدھر کھسک کھسک کر اُس نے گدے کا ایک حصّہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اُس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصّہ مدوّر تھا، ایسا گول کہ اُس کی کمر اُس میں بالکل ٹھیک آتی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کو اس حلقے کی آغوش میں گرا دیا، اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اُسے وہاں سے علیحدہ کر دیے جانے کا خوف ہو۔ اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی، اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا، مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دُور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضا کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور و ادراک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اُسے روشنی، تازگی، دلچسپی، ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسّم نظر آ رہا تھا، جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو۔ اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دُور دُور دوڑانا نہیں چاہتی تھی، بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کئے ہوئے تھی۔

اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے زیر اثر دلفریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور منجھے کی تلاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ! دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی تھی، اور ایک ہلیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے، مگر تیز دھوپ نے اُن کی آدھی شخصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ لاری عجیب خود اعتمادی اور پندار کے ساتھ بے نیازی سے چلی جا رہی تھی اُس کی آواز دُور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلدی جلدی بالکل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں، اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصاً بیل گاڑیوں پر اُس کی فوقیت ڈولی کے دل میں رفعت کا احساس پیدا کر رہی تھی، اور اُسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اُس کی آلودگی اور دلی کی نسبت کم ہو گئی ہے۔ اُن کی کھن کھناہٹ نے اُسے دوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ کی چیخ چانخ سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس تھرتھراہٹ نے اُس کے گرد ایک ایسا ہی نامعلوم بن دیا تھا جہاں، اُس کے خیال کے مطابق، اُسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس نئی پوری آزادی کے ساتھ اُس کے نتھنے پھول سکتے تھے، آنکھیں جھپک سکتی تھیں، ہونٹ کُھل سکتے تھے اور بند ہو سکتے تھے، اور چہرہ جو رنگ چاہے اختیار کر سکتا تھا۔ اپنے اس قدرے بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گزرتے ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کئی ٹیلوں، مزاروں، کنوؤں اور باغوں سے اچھی طرح آشنا تھی، بلکہ بعضے بعضے درخت تک ایسے تھے جنہیں وہ پہچان سکتی تھی۔ رہٹ والے کنوئیں کو دیکھتے ہی اُس نے بتا دیا تھا کہ اب اس کے بعد کھجور کے پیڑ والا باغ آئے گا۔ شہر سے دو میل آگے کنجروں کا ایک تکیہ تھا جہاں کچھ مرد اور عورتیں بیٹھے سینکوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے۔ اوّل تو ڈولی کو اِن لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور

وحشت ناک حلیوں ہی سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی، مگر دو دفعہ اُس نے یہاں ایک چھوٹے قد اور دُہرے بدن کی عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی پُرفن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں، اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اُس پر موٹے موٹے حرفوں میں "نامناسب" اور "مشتبہ" لکھ دیا تھا مگر جو اِن ہی اوصاف کے سبب سے قابلِ توجہ بن گئی تھی۔ ڈولی نے لاری سے سر نکال کر اُسے بار بار دیکھا تھا، اور آج بھی وہ اُسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب لاری وہاں سے گزری تو بنگلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لیکن ڈولی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی، اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی طرف متوجہ ہو گئی.....

مگر صرف ایک چیز تھی جسے وہاں پانے کے لئے وہ پہلے سے تیار نہ تھی، اور جسے وہاں پا کر اُسے تعجب ہوا۔ یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹا تھا۔ چاروں طرف پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے تھے، ایک بہت اونچی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا، اور چند مزدور ٹوکریاں لئے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی ——— ایسے ہی اڈے پر ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی اینٹ اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے رہے، سیلی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سونگھے، اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سُنے ——— اس مکان کی تری کی یاد اُس کے خیال کو جاڑے کی اُن شاموں کی طرف لے گئی جب سکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دھواں ہلکے ہلکے اُٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا، اور بیرونی دُنیا سے اُن کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا، اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور مسحور خطّہ بن جاتا تھا، اور وہاں کی رہنے والیاں مقیّد شہزادیاں۔ کھلی ہوئی باہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آکر لگتی تھی

جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو، اور کندھے اور سینے تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی گم گشتگی اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضہ تھا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ ہی جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سوٹ والا لڑکا اُدھر سے گزرتا تھا ـــــــــــ جب تھوڑی دُور سے بھی اچھی طرح شکل پہچاننے میں نہ آتی تھی۔ مگر وہ چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا، اور ڈولی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ تین دن کے اندر ہی ڈولی کو اُس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شُبہ کی گنجائش نہ رہی تھی، اور وہ بھی اُس کے انتظار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب ٹھہرے رہنے اور کم سے کم ایک بار اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ معلوم وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اُس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا ہو، بلکہ اس کا چہرہ بھی ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ جب ڈولی کی نگاہیں اُس سے مل جاتی تھیں تو اُن آنکھوں کی پُر تفکّر اداسی ایک مختصر ترین لمحے کے لئے اُس کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی۔ نیلے کوٹ میں سے اُس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہوتے تھے، اور اُس کے چمک دار بالوں اور پر متانت چال کے تصوّر نے اُس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا ـــــــــــ وہ گرمیوں میں بھی آتا رہا تھا، اور جاڑوں کی دُھند ہٹ جانے کے بعد اَب اُس کے ہونٹ بھی صاف نظر آنے لگے تھے جن سے اس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اس کے دل کی حسرتنا کی ٹپکتی تھی ـــــــــــ وہ آج بھی یقیناً آئے گا، مگر میدان کو بالکل خالی پا کر بہت مایوس ہو گا۔ وہ کس طرح پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہے گا، اور ہر لمحے اُس کی مایوسی بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ دو تین دن برابر آئے گا، مگر آخر اُس کی اُمید بالکل ٹوٹ جائیگی .....

اُس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دل میں بار بار ٹھونگیں سی مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی! جب وہ گزر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پُکار کر کوئی ایسی بات کہتی

جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں میں گھر جا رہی ہے، یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اس کو اتنی شدید مایوسی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا ..... شاید وہ اُسے اپنی کوئی یادگار دیتا۔ مثلاً وہ اپنا رومال چہار دیواری کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہوتا، اور وہ اُسے پکار کر کہتی "ذرا سنیئے ..... کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتی کیونکہ اس کا چہرہ خود اُس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چہار دیواری کے پار چلا آتا، اور دونوں کسی چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہ گیر بھی نہ چل رہا ہوتا، اور میٹرنیں وغیرہ سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا، اور اُسے پیار کرتا ..... مگر سینما میں تو اُس نے دیکھا تھا کہ گالوں کے بجائے ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا ہے ..... اس لئے فلم کی ہیروئن کی طرح اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا؛ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا، اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور اُنگلی سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ فلمی ہیرو کی طرح اُس کے ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے ..... خود ڈولی اپنے جسم کو اُس سے جس قدر قریب ممکن تھا لگا دیتی اور اپنے گوشت میں اُس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی ..... گرمیاں یکایک جاڑوں میں بدل جاتیں، اور ہر طرف سے دھواں اُٹھ کر انہیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمیوں کی شام کی واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف دینے والی عامیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں کی پُراسراری، ابہام اور ماورائیت لے لیتی۔ بتدریج تاریک ہوتے ہوئے لمحوں کی بیدرد گریز پائی وہیں کی وہیں جم کر رہ جاتی۔ وہ ایک، دوسرے سے اپنا جسم لگائے ہوئے پیار کی باتیں کرتے رہتے، کرتے رہتے، یہاں تک کہ اُن کی یکجائی کا ایک ایک لمحہ ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا ..... بخارات کی طرح دھجّی دھجّی ہو کر اُڑتے ہوئے اندھیرے سے جد و جہد کرنے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے معصوم، آمیز

دہ آلائش سے پاک، اور مصفّا و منزّہ معلوم ہونے لگتے ——— جیسے آدم و حوّا عرشِ بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے دن .... بہجت و مسرّت کی اس فراواں منظری کے ساتھ ساتھ ڈولی کے تحت الشعور میں طرح طرح کے تہدید آمیز خدشے اور وسوسے جڑ پکڑ رہے تھے۔ جب وہ اپنے تخیّل کی سحرکاری سے اچھی طرح لطف اٹھا چکی، اور کسی بچی بچائی چیز کے کھوج میں ذرا سا رکی، تو وہ فتنے اپنی کمیں گاہ سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال اُسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اُسے نظر نہ آیا تو ——— ؟ ممکن ہے وہ اس دوران میں کہیں باہر چلا جائے، یا اتنی دُور مکان لے لے کہ وہاں سے آنا مشکل ہو جائے، یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سُوٹ کسی اور سڑک پر نظر آیا کرے۔ اور یہ بھی بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد اُسے ڈولی پسند نہ رہے، اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پھیر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے۔ اور کیا خبر کہ وہ شروع سے ہی ڈولی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو، اور محض تفنّنِ طبع کے لئے اُس سے نظربازی کرتا رہا ہو، اور اب اس مذاق سے اُس کا دل بھر جائے .... اگر وہ نہ آیا تو ڈولی کی دُنیا کیسی ویران ہو جائے گی۔ کھیل ویل میں اُس کا بالکل جی نہ لگے گا! وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی، مگر ہر دفعہ اس کی نگاہ کسی خوانچے والے یا کسی بڈھے ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آ جایا کرے گی۔ چند دن تو وہ رات تک ٹہل ٹہل کر انتظار کرے گی، مگر پھر اس کا دل اتنا رنجیدہ اور بیزار ہو جائے گا کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی۔ وہ جھنجلا جھنجلا کر اپنے ہونٹ چبایا کرے گی، اور بولنا بالکل کم کر دے گی .... اُسے چاہیے تھا کہ پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اُسے یاد تو کر لیا کرتا۔ مثلاً وہ دیوار کے اُس طرف کوئی چیز گرا دیتی، اور اُس سے دوستانہ مگر انکسار کے لہجے میں کہتی: "مہربانی سے ذرا اِسے اُٹھا دیجئے"۔ جب وہ اُٹھا کر دیتا تو وہ اُس کا مسکرا کر شکریہ ادا کرتی۔ اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے چند لمحے ٹھٹکی رہتی، اور کئی

دفعہ تشکرانہ اُس کی طرف دیکھتی۔ تب تو یقین تھا کہ وہ اُس کے دل میں جگہ پالیتی اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا۔۔۔۔ یا پھر کسی دن ہمّت کر کے اور ساری دُنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کے وہ اُسے روک لیتی اور پوچھتی: "کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟ کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے، یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پروا سے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟۔۔۔۔ میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہی ہوں، یہاں تک کہ میرا سر مارے درد کے پھٹنے لگا ہے۔ کلاس میں بیٹھے بیٹھے بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں، اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکی ہوں۔" وہ خاموشی سے سنتا رہتا، اور آخر کہتا کہ۔۔۔۔ مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا!۔۔۔ یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ دونوں ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اُس سے شرماتے ہوئے کہتی: "آئیے، لو، لائک، ہیٹ (Love, Like, Hate) کھیلیں۔۔۔۔ میں سلیٹ کے ایک طرف کسی کا نام لکھ دوں گی اور آپ کو دکھاؤں گی نہیں، آپ دوسری طرف Love یا Like یا Hate لکھ دیجیے۔" وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی، جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو Hate لکھ دیتا اور کبھی Like، اور جب وہ اُسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی، اور بے چینی سے اُس کے لکھنے کا انتظار کرنے لگتی، وہ سلیٹ پر Love لکھ دیتا، اور جب سلیٹ اُلٹی جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مُسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگتی، مگر اُسکے دل میں خوشی کا دریا اُمنڈ آتا، اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔ اور پھر وہ۔۔۔۔ مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا؟ یا اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا؟۔۔۔ ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اُسے پسند نہ آتے ہوں۔۔۔۔ کیسا اچّھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا اِدھر سے گزرے تو وہ اپنی کا سارلیشمی فراک پہنے ہو۔۔۔ سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا، جس کے گریبان پر خوبصورت سی بو بنی ہوئی تھی۔۔۔۔ اپنی نے

بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھا یا تھا، اور وہ اُس کپڑے کی قیمت دُو روپے گز بتا رہی تھی.... دام تو بہت زیادہ ہیں.... مگر ایسا بھی کیا ہے.... جب وہ گھر پہونچے گی تو اُس کی ماما کہیں گی، "ڈولی، دیکھو تمہاری آنٹی نے آگرے سے تمہیں فراک بھیجا ہے۔" اور جب وہ فراک نکال کر لائیں گی تو وہ بالکل ویسا ہی ہوگا.... یا پھر وہ یوں کہیں گی ا۔ "تمہارے پاپا دلّی گئے تھے. وہاں اُنہوں نے ٹکڑوں والے کی دُکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ اُنہوں نے سوچا کہ ڈولی کے لیے لیتا چلوں۔ بڑا سستا مل گیا وہ. بس ایک فراک کا ہی تھا۔" وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی، اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہوگا.... وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا ترشوائے گی، اور گریباں پر سیپ کے نیلے بٹن ٹکوائے گی. جب وہ اُسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہوگی. وہ اُس دن ڈوپٹّہ بالکل نہ اوڑھے گی۔ اوّل تو ڈوپٹے سے گریبان کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے، دوسرے ڈوپٹّہ کیا ہوتا ہے عذاب جان ہوتا ہے. ہر وقت سنبھالتے رہو، ہاتھ اِدھر اُدھر ہلاؤ تو پھنس جاتے. مسلمان سے لگنے لگتے ہیں ڈوپٹہ اوڑھکر.... یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے، باہر جاؤ تو ڈوپٹہ اوڑھ کر جاؤ، ساڑھی نہ پہنو، میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ.... وہ میٹرن ایک چڑیل ہے، ذرا سامنے سے کھسکنے نہیں دیتی. گرجا سے لوٹتے ہوئے کتنی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر چلے، مگر میٹرن نے ایک نہ مانا. اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو.... اور ہاں، ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں. وہ رنگ برنگ کی ساڑھیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں دس بجے.... یہاں صبح پانچ بجے ہی اُٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے. اُٹھنے میں دیر کرو تو ایک چیخ پکار، آفت. چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں، مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ. یہ بھی تو نہیں کہ اس کے بدلے ایک ٹکیا ہی زیادہ مل جائے. وہاں تو اُلٹی

میٹرن صاحبہ چلّاتی ہوئی آئیں گی: "اس مہینے میں گھی بہت خرچ ہوگیا۔ مجھے دکھا کر لیا کرو روز۔" اور پھر اُوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی ضدیں: "وہ لیں گے ہم، وہ بڑی ہے۔" کام کے وقت تو پڑی سوتی رہیں، اور جب سب ناشتہ واشتہ تیار ہوگیا تو چلیں نخرے کرتی وی۔ یہ جی چاہتا ہے کہ بس دھمک دے اُٹھا کے، اور کچھ نہ کرے۔ یہ سب ہنگامہ ختم ہو کے چکے تو پھر چلو اسکول۔ وہاں الگ مصیبت: سوال کیوں نہیں کئے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کچھ کیا بھی جائے۔ پلنگ پہ پڑ کے بھی تو چین نہیں ملتی؛ حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز سُنائی نہ دے.... اور ہاں، اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو، کھانا پکاؤ۔ اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو، میلے میلے، اُلجھے ہوئے سر، جنہیں چھونے کو بھی جی نہ چاہے۔ بیٹھے کُریل رہے ہیں اُنہیں.... کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے تو میم صاحب ساتھ، انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پکارتی چلتی ہیں: "پلیز، کم ٹو می" (Please come to me.) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دُہراتی ہے۔ اگر میم صاحب نے سُن لیا کہ کسی لڑکی نے "کھم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اب اُس کے پیچھے ہیں، جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اُس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آجاؤ.... اس کے مقابلے میں گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں۔ جیسے کپڑے جی چاہتا ہے پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک.... اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیسا مزا رہتا۔ وہ اطمینان سے سو سُلا کر اُٹھتی، اور اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اُس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی، اور اُس کی کُہنی باہر نکلی رہتی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اُڑتی جاتی، اور ساری دُنیا اُس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی...... مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں کے پانچ روپے

لے جاتے تھے، حالانکہ یہاں وہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی.... فیس زیادہ سہی
مگر اُس کا وہاں داخل ہوجانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا.... گھر جاکر وہ پاپا سے کہے گی کہ
وہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ پاپا تھوڑے سے اصرار کے بعد
راضی ہوجائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکٹ لینے اسکول جائے گی، وہاں
اُسے امّی ملے گی.... امّی کتنا بنتی ہے۔ دیکھو تو زرد، دُبلی پتلی، جیسے بھوکوں ماری
بلّی۔ اور اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے بھلا! اسٹیشن پر کیسا بن بن کر چل رہی تھی۔
ٹرین میں سے ہر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اُس پر دیوانہ
ہی تو ہوگیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔
اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی، اُن کی قیمتیں بتائے گی، طرح طرح سے یہ جتائے گی
کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے اور سب دوسروں کی معاف ہے۔ اسٹیشن پر بھی
جب دوسری لڑکیاں ملائی کا برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں ریشمی رومال ہلاتی
ہوئی اسٹال پر گئی تھی اور ایسی آواز میں کیک اور لیمنیڈ مانگا تھا کہ سب سُن لیں۔۔
....امّی اس سے پوچھے گی: "سرٹیفکٹ کیوں لے رہی ہو تم، ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے
جواب دیگی، "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں جارہی ہوں!" امّی اُس کی طرف رشک
سے دیکھتی رہ جائے گی، اور وہ وہاں سے کندھے اور سر اُٹھائے چلی آئے گی، اور پیچھے
مڑکر بھی نہ دیکھے گی۔ پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول جایا
کرے گی ـــــ اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، روز طرح طرح کی ساڑھیاں
پہن کر ـــــ کپڑوں کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ دراصل وہ سبز پھولوں والے
فراک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے ارادہ کرلیا کہ جب وہ پہلے پہل فراک
پہنے گی تو اس دن نہاکر اچھی طرح بال بنائے گی، اُن میں گلاب کا پھول لگائے گی؛
چہرے پر سیل کھڑی (جو اُس کے ہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) مَلے گی، اور

جُوتے کو پالش سے خوب چمکا لے گی۔ اُسی دن وہ اپنے چار آنے والے بُندے بھی نکالے گی جن میں اُودی گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کر لے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ جمیلہ کے یہاں جائے گی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ راستے میں اُسے طالب علم، ایکٹر، ڈاکٹر، بابو اور ڈپٹی صاحب چند ملیں گے۔ اُن کی یہ ہمت تو نہ ہوگی کہ اُس سے کچھ بولیں، مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اُس کی طرف گھورنے لگیں گے، آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے، اور اُن میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسروں سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ اُن کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی؛ اُس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزرتی چلی جائے گی۔ تاہم اُس کا دل بلّیوں اچھل رہا ہوگا، اور اُس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑپھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو روک سکے گی۔ ستّے کی شہر آتن بھی اُس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اُٹھائے جھانک رہی ہوگی۔ وہ بھی اُسے دیکھ کر بڑی متعجب ہوگی۔ وہ آہستہ سے پُکارے گی، "ڈولی!" اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے بُلائے گی۔ مگر ڈولی اُس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مُسکرا دے گی، اور آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ اور جمیلہ تو بالکل مبہوت رہ جائے گی؛ وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی، اور اُس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا۔ وہ اپنے ڈوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی جیسے اپنے تنگ پائنچوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جائے گی، اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اُس کی امّاں بھی مسکرا مسکرا کر اُس کی طرف دیکھیں گی، اور فقرہ چُست کرنے کی فکر میں کہیں گی، "اُفّوہ، آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو، ڈولی!" پھر جمیلہ کی بھی زبان کھُلے گی: "ہاں، ڈولی، آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو!" وہ

اُس دن جمیلہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اُس کے فراک پر دھبّہ لگ گیا تو؟ وہ بس ایک جگہ جاکر پلنگ پر بیٹھ جائے گی، اور تھوڑی ہی دیر میں چلی آئے گی یہ کہہ کر: "اچھا، اب تم کام کرو گی۔ میں چلوں"..... وہ جمیلہ کو بتائے گی: "اِسے بو (Show case) کہتے ہیں" وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی، اور کئی انگریزی لفظ بولے گی جنہیں سُن سُن کر جمیلہ بہت مرعوب ہوگی، اور شرم کے مارے اُن کا مطلب بھی نہ پوچھے گی، بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں، وہ سب سمجھ رہی ہے... ... بالکل جاہل ہے جمیلہ بھی۔ پاؤڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا! اُردو تک تو آتی نہیں اُسے۔ اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت وہ کہ ہم بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کپڑے تو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اُس کے کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں، اور اُن میں سے پسینے کی بُو آتی رہتی ہے۔ بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر اُن میں کنگھی ہی کرلے.... شاید عید کے دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو تو پہنتی ہو۔ اب کی عید کو اس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جاکر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں، مگر وہ اس خیال سے رُک گئی کہ کہیں اُسے ندیدہ نہ سمجھا جائے.... اُس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سوّیاں آئی تھیں، اور اگلے دن جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا: "تم کل نہ آئیں۔ ہم تو تمہارا انتظار کرتے رہے۔ آتیں تو ہم تمہاری دعوت کرتے"..... جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر بے بُلائے نہیں جایا کرتے.... وہ اپنے کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی، اور انگریزی میں رقعہ لکھے گی جسے ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جاسکتا ہے۔ رقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے گی، اور پوچھے گی: "کیا ہے یہ؟" تب وہ اُسے مطلب سمجھائے گی.... مگر جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں.... تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابّا سے کہے گی کہ وہ اُسے جانے دیں۔ اُسکے کہنے سے وہ اجازت دیدیں گے۔ پھر جمیلہ آئے گی رات کو بُرقعہ میں لپٹی لپٹائی سمٹی ہوئی۔ وہ اُسے کُرسی پر بٹھائے گی۔ جمیلہ کو

میز پر بیٹھ کر کھانا عجیب معلوم ہوگا، اور وہ کچھ سٹ پٹاسی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اُس کی طرف چمچہ بڑھائے گی: "لو، لو، چمچے سے کھاؤ۔" جمیلہ بڑی شرمندہ ہوگی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گی۔ وہ جمیلہ کو فلموں کے قصّے، اسکول کے کھیلوں کا حال اور میم صاحب کی باتیں سُنائے گی جو اُسے پریوں کے مُلک کی داستانیں معلوم ہوں گی جہاں کی سیر کا وہ خیال تک نہیں کرسکتی۔ خصوصاً یہ سُن کر اُسے بڑی حیرت ہوگی کہ فلم دکھانے سے پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے.... میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل میں تعجب کر رہی ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک بڑھاتے ہوئے کہے گی: "لو، کیک لو.... یہ کیک ہے۔ انگریزی ہوتا ہے یہ۔ اِسے انڈوں سے بناتے ہیں۔" وہ یہ بھی پوچھ لے گی: "تم نے چاکلیٹ کھائی ہے جمیلہ؟..... انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ.... اِتنی بڑی بڑی تختیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی مزیدار ہوتی ہے۔ ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی ہیں۔"...... وہ اُسے یہ بھی سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنا ہنستی ہیں، گاتی ہیں، مذاق کرتی ہیں، اور کیسا کیسا لُطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے گی، اور کچھ کِھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے گی...... وہ جمیلہ کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا ——

ایک مُٹھی ریت آکر اُس کے چہرے پر اِس بُری طرح گرا کہ اُس کی آنکھیں اور مُنہ کِرکِرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہوگئی تھی، اور درخت دیوانہ وار ہل رہے تھے۔ آسمان گرد سے بالکل اَٹ گیا تھا، اور خالی کھیتوں میں دُور دُور تک بگولوں نے اُٹھنے اور بکھر کر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا گویا اُنہوں نے ایک دوسرے سے شرط بدر رکھی تھی۔ پرندے کی طرح چکّر بناتے ہوئے اُوپر چڑھنے کے باوجود اُن کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جا سکتا تھا، مگر نیچے گرنے میں اُن کی سُستی، ٹھیراؤ، نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابلِ برداشت تھی۔ بعض وقت تو وہ اپنے معلّق ہو جاتے تھے گویا اُنہوں نے بالکل ہمّت ہار دی ہو اور اب بالکل

آگے نہ بڑھیں گے۔ ان کی کاہلی دیکھ دیکھ کر ڈولی اپنے آپ سے تنگ ہوئی جا رہی تھی اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیشے پر مکّا مارے یا کوئی ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اُس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے؛ صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پار تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب قریب بچھی ہوئی نظر آتی تھی؛ خشک اور تر کا یہ میل گنجی چاند کی طرح ایسا گھناؤنا تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کھیت اُس کے پیٹ میں سے اُٹھ کر حلق میں اَڑ گئے ہیں اور اُسے قے سی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت اُس کی بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر کی طرح اُڑتے ہوئے آتے تھے جیسے اُس کے دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں گے، مگر جب وہ قریب پہونچتے تھے تو جلدی سے بچ کر نکل جاتے تھے۔ ڈولی اس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اُس کا سر پھوڑ دیں، مگر اُس کے لئے یہ پُرفریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا۔ اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے ڈلے جل رہے تھے، اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے اُلٹی چبھن ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے، اور اتنے لوگ ایک ساتھ مِل کر بول رہے تھے کہ لاری میناِر بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز دوسرے سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا: "ارے جناح، جناح .... جناح نے تو وہ کیا جو ....!" چند آدمی "کسان .... کسان ...." کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے، مگر دوسرے آدمی اُن کی بات کاٹ کر خود بھی "کسان .... کسان ...." کہنا شروع کر دیتے تھے۔ ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کر لے، مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لفظ ضرور آ کر اُس کے مغز میں ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ غوں غوں، غوں غوں مچا رکھی تھی جس کی دُھن پر چکّر کھاتے کھاتے اُس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا، اور گرا پڑ رہا تھا.... اُس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی، مگر آنسکے پپوٹے

اب وہ لوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اُس نے ہر چہ بادا باد کہہ کر اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا، اور بالکل بے حرکت ہو گئی۔ آنکھوں کا کھُلا ہوا حصّہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چپک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا، اور اُس کی آنکھیں آخر بند ہو گئیں ...... نیند میں ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھن بھناہٹ صاف سُن رہی تھی؛ مگر وہ اُس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اُسے لوری دے رہی تھی، اور دوسری مداخلتوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس سے زیادہ اُسے زمان و مکاں کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ کسی لطیف شے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی، بلکہ محض ایک شناخت، صرف ایک خیال ——— "میں" ——— باقی رہ گئی تھی۔ اُس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی تھی، جس میں کبھی کبھی ہلکی سی سفیدی کے دھبّے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھن بھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے۔ صرف ایک دفعہ اُسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصّہ نظر آیا تھا جسے اُس نے پہچان لیا تھا کہ آئرین کا ہے، مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا، اور اندھیرے کی روانی پھر اسی طرح جاری ہو گئی تھی ....

لاری کے ایک دھچکے سے اُس کی آنکھ کھُلی۔ لاری ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھی، سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت گھٹی کاٹ رہی تھی، اور دوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اٹھا اُٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچّے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے، اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا درد تو اب اچھا ہو گیا تھا، مگر سر بھاری تھا اور آنکھیں نیند کی وجہ سے اچھی طرح کھُل نہ رہی تھیں۔ اِس کے علاوہ اُسے کچھ زکام سا بھی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے

اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا ہے اور اُس کے بجائے ٹھوڑی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اُس نے گردن اکڑا کر انگڑائی لی، اور سڑک کے نظاروں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اُس کی گرانی کچھ دور ہو جائے۔ گاؤں سے تھوڑی دور آگے ایک بچہ روتا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چپ ہو گیا، اور اُس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے کرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اوپر اٹھا لیا، اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد دوپٹہ دانتوں میں دبا رکھا تھا، اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈولی کو اُس کے پیلے پیلے دانت بالکل پسند نہ آئے، اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو گویا ہوا میں معلق تھے اور ایک تعجب خیز عزم کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے...... مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصنوعی دلچسپی کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی، اور اُسے یقین ہو گیا کہ اپنا دل بہلانے کے لئے اُسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور واقعوں کو رد کر دینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ صرف "غزل الغزلات" ہی تو اس کی کار برآری ہو سکتی ہے جس سے اس کا تعارف پرنسس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائبل سنتے ہوئے اُس کے پاس آ گئی تھی، اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اُس سے کہا تھا: "تم نے یہ دیکھا ہے، ڈولی؟" اُس نے "غزل الغزلات" کا ایک صفحہ کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا تھا، اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخون کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے پوری "غزل الغزلات" کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا، اور ڈولی نے اکیلے میں بھی، یہاں تک کہ اُسے کئی مزیدار حصے یاد ہو گئے تھے۔ اور اُس کے کتنے ہی ویران اور آزردہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے......

اُس دن کہ جب اُسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اُس کی طرف دیکھتا ہوا چلتا ہے، وہ رات کو پلنگ پر لیٹی ہوئی دیر تک اُن حصّوں کو یاد کرتی رہی تھی۔ اُس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں، باہیں تکیئے کے دونوں طرف پھیلا کر اُلٹی لیٹ گئی تھی، اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کی پوری قوت سے دبایا تھا جس کی ہلکی سی کسک میں اُسے انتہائی لطف ملا تھا۔۔۔ اُن ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اُس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کہیں لارتی ہیں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ـــــ جیسے وہ اپنے بدن کا کوئی حصّہ عُریاں کرنے والی ہو۔ اس کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ ایک ایک دُو دُو جملے دُہرانے شروع کر دیئے تاکہ وہ ہر ایک سے پوری طرح فیضیاب ہو سکے۔۔۔ ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابھی اُس کی چھاتیاں نہیں اُٹھیں۔۔۔ تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں۔ تیری ناف گول سا پیالہ ہے۔۔۔ وہ اپنے مُنہ کے چوموں سے مجھے چُومے۔۔۔ میرا محبوب جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے۔۔۔ میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے لئے دروازہ کھولو میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری!۔۔۔ دیکھ تو خوبرو ہے۔ دیکھ تو خوبصورت ہے۔۔۔ اُس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے اور اُس کا دہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے۔۔۔ اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں جب ایک دن فریڈی کہانیاں سُنتا سُنتا اُس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات بھر اُسکی گردن میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی، اور اُسے بڑی گہری نیند آئی تھی۔ اس لئے اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب کے چھٹیوں پھر فریڈی کو اپنے پاس سُلائے گی۔۔۔ ایسے ہی جب ایک دفعہ برنِس اُس کے ساتھ سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بے ہوش ہو گئی تھی۔ اگلے دن صبح کو عیسائیوں کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لئے وہ دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر چُور ہو گئی تھیں، اور اُنہیں پھر صبح سویرے اُٹھنا تھا۔ برنِس کا تو اتنا بُرا حال تھا کہ اُس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی بلکہ

ڈولی کے ساتھ ہی سو رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہوگئیں۔ مگر پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ اُن کی باہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں اُلجھ گئیں.... صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں، اور اُنہیں اپنی کیفیت دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ مگر اُن کے سینے مِل رہے تھے، اور اُن کے گلگلے پن اور نرماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اُٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرما اور لجا نہیں رہی تھیں بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو.... وہ دونوں جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب تھے، اُن کے بعد مرد، پھر عورتیں، پھر لڑکیاں، اور آخر میں پھر مرد۔ وہ اور برنس دونوں ایک لائن میں چل رہی تھیں، اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے باتیں کرتی جاتی تھیں۔ سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے، اور گانے کے ٹکڑے لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کے دو دو تین تین کے مجموعے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں اور مشین کی طرح اُٹھ اور گر رہے ہوں.... ہاتھوں میں میخیں گاڑ کر سولی پہ چڑھا دیا۔ .... یسّو نے تیرے واسطے اپنا لہو بہا دیا.... اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا، یسّو یسّو من میں آ جا، ہم کو بچا جا، پاک بنا جا.... یہ گانا اُسے اچھا تو معلوم ہوتا ہے لیکن خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو؟ اُسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا جو ہاکی اسٹک لیے سائیکل پر جا رہا تھا، جلوس کو دیکھ کر اُتر پڑا تھا، اور اُس کی طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا خصوصاً جب وہ اپنے پان میں سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنستا تھا تو اُسے اتنی نفرت ہوتی تھی کہ اُس نے ڈوپٹہ سر اور چہرے پر کھسکا لیا تھا، اور بہت دیر تک خاموش نیچی نظریں کئے ہوئے چلتی رہی تھی.... ہاں، اُمّی جلوس کے دن بڑی خوش رہتی ہے، اُسے اپنے کپڑے اور خوبصورتی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے

ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں.... اُس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی اُس کی چاپلوسی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مشن کا ولیم سنگھ بھی آج بھی کہ جب وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ایمی کی خوشامد میں لگا رہا تھا۔ اوروں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکالنے پر بھی ٹوک دیتا تھا، مگر ایمی سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھر رہی تھی اور وہ اُسے ایک لفظ نہ کہہ رہا تھا.... اور اب تو وہ اپنے آپکو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آنرین نے اُسے بتایا تھا کہ ایمی کو اسکے فرسٹ آنے کی اُمید ہے۔ کہیں آتی نہ ہو! اب تک ہمیشہ ڈولی فرسٹ آتی رہی ہے، اور اس دفعہ تو مس جونسن نے اُسے اپنے گھر بلاکر پڑھایا تھا.... بہت ہی اچھی ہیں مس جونسن! اُن کا جوان ہنس مکھ چہرہ اور اُس پر سنہری عینک، کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر اسی کو دیتی ہیں۔ اور اُس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ امتحان کے قریب بیچاریوں نے خود اُسے بلاکر پڑھایا تھا، اور اس سے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی اُن کے پاس پڑھنے آیا کرے۔ ایک دن جب وہ اُنکے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی وہ اُس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں، اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں...... جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں کہ اُس کا جی چاہتا ہے ہلکے سے اُن کا گال چوم لے۔ کتنی مرتبہ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اُن سے کہہ دے کہ وہ اُن سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُنہیں اپنے سینے سے لگالے اور اپنے بازوؤں میں لئے رہے، مگر وہ ہر بار شرما کر رہ گئی ہے اور اُن سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی ہے.... ایک مرتبہ وہ اُسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں۔ وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی.... اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے.... اُن کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی، ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لئے ترستی ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے، اسکول والے کم بخت ذرا نہیں نکلنے دیتے

اُمی سے "اچھوت کنیا" اور "پکار" کی تعریف سُن کر اُس کا کیسا کیسا جی لوٹا ہے کہ کسی طرح اُسے بھی دیکھنے کو مل جائیں، مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی.... اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا مِل جائے.... وہ مس جونسن ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے.... یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی ہو، اور یکایک اُس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آکھڑے ہوں۔ وہ نیلا سُوٹ پہنے ہوئے ہوں گے، اور اُن کے سُنہری عینک لگی ہو گی۔ لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر اُن کی طرف دیکھیں گی، اور یہ پوچھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اُسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی، اور پھر پڑھنے سے اُن کا دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی۔ وہ اُس سے کہیں گے، "ڈولی، میں ابھی ابھی آرہا ہوں۔ آج کل یہاں "اچھوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما!" وہ خوشی خوشی تیار ہو جائے گی اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اُن کے ساتھ سینما جائیگی.... جوزف بھائی کے سُنہرے بال کیسے چمکتے ہیں، اور اُن کے گورے رنگ پر نیلا سُوٹ تو بہت ہی سجے گا.... وہ سینما ہال میں بیٹھی اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہوگی، اور اتنی خوش ہوگی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا ــــ بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے ــــ جسے اُمی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے کس موقع پر گایا جاتا ہے۔ گھنٹی بجے گی، اور ہال میں اندھیرا چھا جائیگا، اور پھر پردے پر.....

سامنے وہ سفید دھرم شالہ نظر آرہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آگیا ہے۔ اِس علم کے تقریبًا ساتھ ہی ساتھ اُسے وہ نیا مکان زمین میں سے اُبھرتا ہوا دکھائی دیا جو اڈے پر بن رہا تھا، اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین کے باہر نکل آیا۔ اِس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی، مگر اب اُس میں کچھ تمکنت، خود اختیاری اور

تفکّر کا سکوت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ اب وہ خواہ مخواہ گُن گُن نہ کر رہا تھا، بلکہ اُس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیرے میں کھینچ لیا تھا۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا، اور اس میں سے چھت بہت اُونچی نظر آ رہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر اتنا اُونچا کر دے کہ اندھیرا اُسے ڈھک لے .... ڈولی نے اپنا اُوپر کا جسم اُٹھا کر لاری کے باہر پھینک دیا جو شیشے میں سے سورج کی کرن کی طرح آسانی سے نکل گیا، اور ڈولی کی طرف مُنہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ گویا نصف مجسّمہ تھا، حالانکہ اُس کے رنگ میں سنگِ مرمر کی سی دُرشتی نہ تھی، بلکہ اُس کے رنگ زندگی کے رنگ تھے۔ یہ مجسّمہ بالکل عُریاں تھا۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی، مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا، خصوصاً اُس کی کنپٹیوں کے پاس کے حصّے اب اتنے اُبھرے ہوئے نہ رہے تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ترتیبی نہ تھی، بلکہ وہ ایک نورانی سورج کے ساتھ میانہ وار اُوپر سے نیچے آ رہے تھے۔ پیشانی بھی کُشادہ تھی، اور اس کی متین لمبی پلکیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھیں بھرے بھرے، صاف شفّاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی، انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شانوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں جو بے داغ، نرم گلابی رنگ کی، موزوں، متناسب، بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمنّاؤں کی گدگدی سے پُر جوش نہ تھیں، بلکہ اِن سب سے اُونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لُطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسّمے کے انداز میں آرام، قرار، جمالیاتی غور و فکر، اس سے مُلتج سرشاری اور محبوبیت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے"!....

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اُسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لئے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اُسے

یہاں کیا ہو رہا ہوگا.... شاید ماما گہرون کا سایہ پہنے جھاڑو دے رہی ہوں.... شاید پاپا بزار سے لکڑیاں لے کر آتے ہوں، اور ماما اُن پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بھیگی ہوئی آواز میں آنٹی کی خوش نصیبی کا تذکرہ کر رہی ہوں، اور اس کے مقابلے میں اپنی.... مگر ڈولی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گزارے جا سکتے تھے، خیالات کی اس روش سے مکدّر کر لے۔ چنانچہ اُس نے نئی ریل چڑھائی.... فریڈی اپنا نیلا نکر اور ہری قمیص پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہوگا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا اور اُسکی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا.... پاپا ابھی دورے سے واپس آتے ہونگے، اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ وہ پوچھیں گے، "ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر اُنھیں بتائے گا، "ڈولی بُوا آگئیں، پاپا!" وہ کہیں گے، "تو آگئی بیٹی ڈولی؟" اور وہ جواب دیگی، "جی ہاں، پاپا".... ماما باورچی خانے میں اس کے لئے کوئی اچھی سی چیز تیار کر رہی ہوں گی۔ آواز سن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی، "آگئیں لو ڈولی بھی! میں تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہوگی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں، شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمہیں۔ روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈولی بُوا کے آنے میں کے دن رہ گئے.... اور آج تو وہ صبح ہی سے تیار پھر رہا تھا".... ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اُسے بتائیں گی کہ اُس کے پاپا اس کے لئے ایک چھوٹی سی سفید بلّی لائے ہیں جس کی اُسے بڑی خواہش تھی.....

سوچنے کو تو وہ سوچے چلی جا رہی تھی، مگر ویسے اُس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا، اور اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے۔ پھر بھی وہ اِس آخری تنکے سے چمٹی ہوئی تھی، اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اُسکے دل پر چرکا سا لگتا تھا، اور اُسکے گلے کی رگیں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دُور ہے، مگر اُسے اِسکے خلاف ناقابلِ تردید شہادتیں ملے چلی جا رہی تھیں۔

وہ اُمید کر رہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکل چلی جائے گی اور پھر کبھی نہ رُکے گی۔ یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اُسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ مگر یہ علم اسکی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز، رُکاوٹوں کو توڑتی، کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو، اور اُسے قصبے کے اڈّے پر لا کھڑا کریگی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اُسکے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی بھن بھناہٹ پر خود ہی مست ہو ہو کر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی، اور اُسے ڈولی کے جذبات کی مطلق پروا نہ تھی۔ ڈولی بیچاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اُس کے دشمن بنے ہوئے تھے، اور اُسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے.... آخر اُس نے ایک گہرا سا سانس لیا، اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا.....

اڈّے کے قریب پہونچکر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اُس کی اُمید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے، ورنہ کم سے کم تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے۔ مگر جلد ہی کلچ ایک دُرشت کڑکڑ کے ساتھ بولا، اور انجن رُک گیا۔ ڈولی کے کانوں میں خاموشی بھربھرانے لگی، اور اُسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دُنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اُتر رہے تھے، مگر وہ ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آکر اُس سے پوچھا کہ "اجی سامان چلیگا؟" تو اُس نے گھُٹتے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد "ہاں" نکالا، اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو، اور آخر کار اُس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لئے تیار کر لیا ہو.....

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اُتروا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اُس پار سب سے الگ کھڑی ہو گئی۔ اُس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اُسے اس خیال سے بےچینی ہو رہی تھی کہ لوگ اُسکی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت

ڈولی کو اس وقت اِس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیا نہیں کر رہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اُسے اُن کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے۔ اس لئے وہ اُفق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدھم ہو گئی تھی، اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً سرسراتے جا رہی تھیں۔ زمین کا غبار اُٹھ اُٹھ کر آسمان پر پھیل گیا تھا، اور اس نے آسمان کو گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اِس عریض چادر پر سورج کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی، اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ اُلٹا اور دھول میں اٹا جا رہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی، اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے اُن کے ساتھ دغا کی ہو اور اب اُن میں گلے اور شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو.....

ادبی دنیا جنوری ۱۹۷۲ء ۲۴ نومبر ۱۹۷۱ء

اندھیرے کے پیچھے

جس کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا تھا اور اس کی تمام چالاکیاں بالکل بے نتیجہ رہی تھیں۔ جب اس کا روٹی پکانے کا نمبر ہوتا تو ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اور آج تو گوشت کا دن تھا۔ تین دن تک ارہر کی دال کو آلوؤں سے تبدیل کرتے کرتے لڑکیوں کی بھوک بالکل غائب ہو گئی تھی۔ یوں تو یہ پرہیز ایک ہفتے سے پہلے کبھی بھی نہ ٹوٹتا تھا۔ مگر اس دفعہ شہر کے گوشت کے بارے میں ہیلتھ آفیسر کی غیر تسلی بخش رپورٹوں نے اس کی مدت میں تین دن کا اضافہ کر دیا تھا۔ دراصل نئی مس صاحبہ کو جو ابھی امریکہ سے آئی تھیں اپنے انسٹی ٹیوٹ کی لڑکیوں کی صحت کا بہت خیال تھا۔ جب انہیں ناخنوں کی مٹی تک کی اتنی فکر پڑی رہتی تھی تو یہاں تو معاملہ اور بھی گہرا تھا۔ اور آخر انہیں کیوں نہ فکر رہتی؟ وہ کوئی روپے کے لالچ سے تو ہندوستان آئی نہ تھیں کہ بس اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھیں اور دوسروں کے مفاد کو نظر انداز کر دیں۔ وہ تو جیسا کہ وہ اکثر بتایا کرتی تھیں، امریکہ کے ایک مرحوم لکھ پتی کی اکلوتی وارث تھیں، اور یسوع کی محبت اور اس کے دین کی خدمت کا جوش انہیں سات سمندر پار گھسیٹ لایا تھا۔ اسی جذبے کے ساتھ ساتھ وہ امریکہ کی "Eat More Fruit Association" کی سرگرم کارکن تھیں، اور حیواناتی غذا کو ترک کر دینے کی دل و جان سے قائل۔ گو انہیں اپنے شوربے کی اشتہا

کا شوق مجنونانہ حد تک تھا، مگر افسوس ہے کہ اُن کے نوآکہاتی نظریوں کے مقابلے میں انسٹی ٹیوٹ کا فنڈ بڑا رجعت پسند واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں پر اپنی مخصوص ریاضت عائد کرنے میں بھی اُنہوں نے مسیحی نرمی سے کام لیا تھا، اور لڑکیوں کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا روحانی کرب اور اپنے ضمیر کی اذیّت قبول کرلی تھی۔ اُن کے وسیع مطالعے اور ایک عمر کے تجربے نے بھی اُنہیں یہی سکھایا تھا کہ گناہگاروں کو آہستہ آہستہ سیدھی راہ پر لانا ہی آخر میں زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے ہیلتھ آفیسر کی رپورٹوں کی آڑ میں پہلا اصلاحی قدم اُٹھایا تھا۔ مگر بیماروں نے اپنی روایت کی پوری پابندی کے ساتھ معالج کے نشتر کے نیچے تلملانا شروع کر دیا تھا۔ روزۂ موعود کے ملتوی ہو جانے کا حکم سن کر لڑکیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے، اور وہ کچھ سوچتی ہوئی اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ اُن کے قدموں نے شام کو باورچی خانے کی طرف تیزی سے اُٹھنا چھوڑ دیا تھا اور طعام نامے سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود وہ آدھی آس اور آدھی یاس کے ساتھ روزانہ پوچھتی تھیں، "کیا پکا ہے؟" وہ بڑے ڈھیلے ہاتھوں سے رکابی پکڑتی تھیں اور آدھا تہائی کھا کر ہی کھڑی ہو جاتی تھیں۔ آخر روزہ کھولنے کا دن آ گیا تھا اور اُن میں نادانستہ طور پر زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے افطار کا وقت قریب آتا جاتا تھا اُن کی آنکھوں کی تڑپ اور گالوں کی پھڑپھڑاہٹ زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کھانا پک چکنے پر تو وہ بھوکے چیونٹوں کی طرح آ چپٹی تھیں۔ فیتھ نے ا… خیال سے پہلے ہی آٹا زیادہ لے لیا تھا اور دوسری پکانے والیوں کو بھی یاد دلا دیا تھا، مگر پھر بھی آٹے اور آٹا گوندھنا پڑا تھا۔ اور اُس پر ستم یہ ہوا کہ رِلّی سر کے درد کا بہانہ کر کے کھسک گئی، اور اُسے روٹیاں بھی خود سینکنی پڑیں۔ دم گھونٹنے کو پتھر کے کوئلے کا دھواں ہی کون سا کم تھا کہ اُس میں لڑکیوں کی چیخ پکار بھی شامل ہو گئی تھی۔ —— "اِتنا سا شوربا؟" "ایک بوٹی تو اور دو!" چھوٹی لڑکیاں خیر کریں تو کریں، مگر بڑی بڑیوں نے بھی تو یہی ضد میں لگا

رکھی تھیں۔ اُس نے تنگ آکر پوری کی پوری دیگچی اُن کے سامنے رکھ دی تھی۔ اور آخر جب وہ کھانے بیٹھی تو دیگچی میں صرف چند چھیچھڑے، کچھ ہڈیاں اور دھوون جیسا شوربا باقی بچا تھا، اُس نے غصّے میں سارے چھیچھڑے اور ہڈیاں کُتّوں کے سامنے پھینک دی تھیں، اور جلتے بھُنتے روٹی حلق کے نیچے اُتار رہی تھی۔ اُسے اپنی قابلیت اور دیانت داری کی بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی، کیونکہ لڑکیوں کے اس ریوڑ میں انتظام قائم رکھنا ناک سے آگ نکالنے والے بیلوں کو جوتنے سے کم نہ تھا۔ اُس نے چاہا تھا کہ جیسے کئی دن سے ہو رہا تھا ایسے ہی آج بھی کام دھندے سے جلدی فراغت پاکر رات کی تاریکی چھا جانے سے پہلے پہلے کمرے میں پہونچ جائے تاکہ شام کے دھندلکے کی روشنی میں بستر اچھی طرح بچھا سکے۔ لیکن وہ اس تمام جھاڑ جھنکاڑ سے اپنے آپ کو نکالنے میں آسانی کے ساتھ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اندھیرے نے اُس سے بازی جیت لی تھی، اور جب وہ کمرے میں پہونچی تو وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور دلدلوں کی زہریلی گیسوں کی طرح فضا میں منڈلا رہا تھا۔ پہلے پہل تو اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسا بھر گیا کہ وہ یہ بھی نہ معلوم کر سکی کہ اُس کا پلنگ کدھر ہے۔ اندھیرے کے چکّروں نے سمتوں کے شعور تک کو مسخ کر دیا تھا اور ہر چیز، ہر خیال، ہر احساس بے طرح گڈ مڈ ہو گیا تھا۔ اگر فلیتھ سے پوچھا جاتا کہ اُس کا ہاتھ کہاں ہے تو اُسے یقیناً اپنے چاروں طرف ٹٹولنا اور اپنے دماغ پر زور ڈالنا پڑتا۔ لیکن اندھیرے کی زرد چیتیوں کو اپنی آنکھوں سے گھیر گھیر کر اُس نے اُنھیں اپنے بستر پر اُتار ہی لیا۔ اسکول نے فلیتھ کو اپنا کمرہ صاف رکھنے پر ایک بار تمغہ دے کر اُس کی رُوح کو بالکل انعاموں کی زرخرید لونڈی بنا دیا تھا، بلکہ اگر کوئی چیز اس سے بھی بدتر ہوتی ہے تو وہ بھی۔ وہ ہر وقت اپنی جان اسی فکر میں گھلاتی رہتی تھی، اور انتقاماً نہ سرگرمی سے جھاڑ پونچھ اور اُلٹ پلٹ میں مشغول نظر آتی تھی۔ گویا زندگی کی ساری ذمّہ داریاں اُس کے کندھوں سے اُٹھالی گئی تھیں، اور ان سب کے بجائے ایک اہم ترین فرض اُس کے سپرد کر دیا گیا تھا، اِس

کوٹھی کا ناج اُس کوٹھی میں کرتے رہنا۔ اِس وقت بھی کہ جب اندھیرا مکڑی کے جالوں کی طرح اُنگلیوں میں پھنسا جاتا تھا اور مخاصمت آمیز شرارت کے ساتھ اُسے اپنا کام نہ کرنے دے رہا تھا، اور جب کہ اسکول کی عمارت کے قریب لگے ہوئے کھمبے کی روشنی جو پہرا دینے والے سنتری کی طرح اپنے مقرر حلقے سے ایک انچ آگے نہ بڑھتی تھی، دور ہی سے کمرے کی فضا میں دل شکن بے بسی، لاچاری اور تنہائی کا احساس پیدا کر رہی تھی، فہیمہ جھنجلا جھنجلا کر بستر کو اِدھر سے اُدھر کھینچ رہی تھی، بار بار اُس پر ہاتھ پھرا رہی تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ بستر دونوں طرف سے برابر ہے یا نہیں، لحاف کی تہیں تو ٹھیک ہیں، چادر پر کوئی شکن تو نہیں رہ گئی۔ لیکن اُسے خوب معلوم تھا کہ اُس کی اِن ساری احتیاطوں کا انجام کیا ہونا ہے، کچھ دیر بھی نہ گذرے گی کہ روزا آندھیوں اور بگولوں کی طرح طوفان اُٹھاتی آئے گی، اور اُس کے جھپیٹوں میں چادر تو الگ رہی، پلنگ کی چولیں ہی سلامت رہ جائیں تو بہت جانو۔

اپنے بستر کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اُس نے چاہا کہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹال کر اپنی چھوٹی بہن کا بستر بھی کھول دے۔ لیکن، شیلا! یہ آٹھ سال کا چھوکرا بالکل ناقابلِ اصلاح تھا۔ بس اسکول سے چھٹی ملی نہیں اور وہ پہنچی دو چار لڑکیوں کو جمع کرکے پیڑوں کے نیچے کیلم کانٹی کھیلنے۔ اور کپڑے خراب کرنے میں اُس نے خاص مہارت بہم پہونچائی تھی۔ یہاں تو لڑکیوں کو ہفتہ میں دو جوڑوں سے زیادہ دھوبی کے یہاں ڈالنے کی اجازت نہ تھی، اور اُس نے یہ حال کر رکھا تھا کہ کپڑے پہن کے نکلی ہے اور چلی آ رہی ہے تھوڑی دیر میں مٹی تھوپے۔ خیر اس سے تو خود کپڑے دھو کے بھگت بھی لیا جاتے، لیکن اُسکے کپڑے پھاڑتے رہنے کا کیا علاج تھا۔ ابھی اسی سال میں اُس کا ایک فیتا تو دھوبی کے یہاں سے آتے ہوئے کپڑوں کو الگ الگ کرنے میں کسی لڑکی نے اُڑا لیا تھا، اور دو نئے فراکوں کے دامن اُس نے خود اپنی دُھاچوکڑی میں چری بتی کر کے رکھدئے تھے۔ اب وہ گھر جائے گی تو ماما اُلٹی اُس پر بگڑیں گی کہ ذرا سا چھوٹی بہن کا خیال بھی

نہیں رکھتی۔ چھوٹی بہن اپنا خیال رکھنے بھی دے! وہ بڑے شکوے کے لہجے میں جیسے نیلم کو اپنی ماں کو قلاش بنا دینے کا تہیّہ کر لینے پر شرم دلا رہی ہوں، کہیں گی! "یہ تو سوچو بھلا میں کہاں تک ہر سال نئے نئے کپڑے بنائے جاؤں؟" وہ تو کئی دفعہ سوچ چکی تھی اور ہر دفعہ اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اُسے ہر سال نئے نئے کپڑے بنائے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے بعض بیبی کوٹ تو تین تین سال پرانے تھے، اور وہ بلیزر کا نیلا کوٹ بھی دو سال تو یونس بھیا پہن چکے تھے اور دو ہی سال سے وہ پہن رہی تھی۔ ماما اس پر غور نہیں کرتیں کہ اگر وہ اتنی احتیاط نہ برتے اور چھوٹے بیبی کوٹوں میں بھی بیفے بڑھا بڑھا کر کام نہ چلاتی رہے تو انہیں ہر سال کتنے کپڑے بنانے پڑیں۔ رائے تو انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کی لینی چاہیئے جسے اپنے کپڑے اُٹھا کے رکھ لینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔ یہاں آکر دیکھیں ماما تو انہیں پتہ چلے۔ چھٹی کے دن صبح اُٹھ کر منہ بھی نہیں دھوتی۔ اگر اُسے ٹیچر کا ڈر نہ ہو تو شاید کبھی بھی منہ نہ دھوئے، اور نہ کنگھا کرے۔ اور یوں بالوں میں کنگھا پھیر لینے سے ہوتا بھی کیا ہے، سارے سر میں تو جوئیں بہتی رہتی ہیں۔ ایسی سے تو وہی اُلجھے جس کے دماغ میں کیڑے ہوں۔ اگر اُس کا بستر بچھا بھی دیا جائے تو کیا فائدہ؛ جب میٹرن ڈانٹ کر اُسے باہر سے بھگائے گی، تو وہ دھپڑ دھپڑ کرتی ہوئی آئے گی اور مٹی میں سنے ہوئے پیروں سمیت لحاف میں گھس جائے گی۔

شیلا کی بدعنوانیوں پر غور کرتے کرتے اُس کی بیزاری اور خستگی آپ ہی آپ تحلیل ہوتی چلی گئی، اور اُسے شیلا کے عیب ڈھونڈھنے میں ایسا مزا آنے لگا جیسے بچوں کو موٹی ناک والی بھدّی بھدّی تصویریں بنانے میں آتا ہے۔ چنانچہ جب وہ پینسل سے آخری خط کھینچ چکی تو اُس نے شیلا کی طرف سے اپنے دل کو اتنا سخت نہیں پایا۔ دوسرے، باہر میدان میں جہاں سے لڑکیوں کے کھیلنے اور شور وغل کی

آوازیں آرہی تھیں، جانے کے خیال سے وہ ایک عجیب ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی اور
کمرے میں ٹھہرے رہنے کا جلد سے جلد کوئی عذر تراشنے میں ایسی کوشاں تھی جیسے وہ
اس غیر مناسب فعل کے لیے کسی کے سامنے جوابدہ ہو۔ شیلا کا بستر پھاڑنے میں اسے
اتنا وقت ملنے کی امید تھی کہ مختلف بہانوں کے امکانات پر غور کر سکے؛ بلکہ خود اپنے ایک
بہانہ بنا لینے میں بھی کوئی خرابی نہ تھی۔ اتنی دیر میں وہ کمرے کی تاریکی سے کچھ مانوس تو
ضرور ہو گئی تھی، مگر تھوڑی تھوڑی دیر میں اندھیرے کی ایسی رو آجاتی تھی جو آنکھ جھپکنے
میں ہستی کی پہنائیوں کو غرق کر لیتی تھی۔ اس کے دل میں ڈر کا تو نام تک نہ تھا، مگر دور
کمپاؤنڈ میں چمکنے والے بلب کی روشنی کے سامنے اور لڑکیوں کی چہلوں اور قہقہوں کے
درمیان اندھیرا اس کے گرد ایک محیط تھا جیسے کوئی جادو کا حلقہ جس میں سے نکلنے کی
وہ محبوس ہونے کے احساس کے باوجود آرزو تک نہ کر سکتی تھی۔ چمگادڑوں کے سوچنا تی
پر ابھرتے تھے اور وہ ان کے کنارے بھی اچھی طرح نہ دیکھنے پاتی تھی کہ پھر ڈوب جاتے
تھے۔ فیتھ اور آشنا چہروں کے درمیان انتھاہ اونچائیاں اور گہرائیاں حائل تھیں جنہیں
عبور کرنے کے لیے کوئی بال جیسا باریک پل تک نہ تھا۔ اس کی ماما کا شفیق چہرہ اور محبت
بھری آنکھیں تک جنہیں وہ اپنے تصور کی پوری روشنی پہونچانے کی کوشش کر رہی
تھی، اس تیرگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے کافی نہ تھیں جس کی ذہنی روح اور مدافعت
کو خاطر میں نہ لانے والی کروٹیں اس کے بازوؤں کو ٹھوکے دے دے کر اسے مجبور
کر رہی تھیں کہ وہ انہیں مصلوب یسوع کی تصویر کی طرح دونوں طرف پھیلا دے اور
اپنے آپ کو حوالے کر دے۔ اور وہ واقعی اس کے قریب آرہی تھی کیونکہ یہ گھٹے ہوئے
آنسوؤں جیسا ٹھہراؤ اس کے لیے قابلِ برداشت نہ رہا تھا۔ دور کمپاؤنڈ میں چمکنے والے
بلب کی روشنی کے سامنے اور شادماں و خورسند لڑکیوں کے بے فکر قہقہوں کے
درمیان، اپنے گھر سے ساٹھ میل کے فاصلے پر اس الگ تھلگ کمرے کی پھنکاتی ہوئی

تیرگی اور تنہائی میں وہ چاہتی تھی کہ اپنے جسم اور جان کی انتہائی قوت سے کسی چیز کو پکڑ لے ..... آخر کار شیلا ایک ایسی چیز تھی جسے پکڑا جا سکے۔ وہ کپڑے پھاڑتی تھی، گندگی پھیلاتی تھی زبان چلاتی تھی۔ یہ سب سہی، لیکن اس سے کیا؟ وہ ایک ایسی چیز تو تھی جسے پکڑا جا سکتا تھا، جس کی طرف وہ اپنے اندر سے نکل کر اپنے وجود کی پوری شدت اور گہرائی کے ساتھ بڑھ سکتی تھی ——— جو اُسے اندھیرے کی دست بُرد سے بچا سکتی تھی۔ اُس کی اپنی بہن، اُس کا اپنا خون! اتنی قریب، اتنی نزدیک! وہ لنظام جو یک جا ہو لینے کے بعد اندھیرے کی تلاطم خیزیوں پر بھی ٹھٹھے لگا سکتے تھے ——— ایسے محفوظ، ایسے مامون! ..... اس اندھیرے میں بھی سب کچھ کھو یا نہیں گیا تھا۔ ہوا میں ایک روپہلا پن گندھا ہوا تھا جس کی کرنوں کا عکس وہ اپنے دل میں پا رہی تھی۔ شیلا کے بکھرے ہوئے بالوں والے چہرے نے گھر کی فضا کی اتنی جاذبیتیں اخذ کر لی تھیں کہ صرف اس ایک وجود سے کمرے کا خلا بھرا بھرا ہو گیا تھا۔ وہ اُس کا بچھونا ایسی نرمی اور احتیاط سے کھول رہی تھی جیسے شیلا کے بچپن میں وہ اُسے سوتے ہوئے ایک پلنگ سے اٹھا کر دوسرے پر لٹایا کرتی تھی۔ پیشاب کی جھلیں تک اُسے منغّض نہ کر رہی تھیں، بلکہ بچھونے میں سے نکلی ہوئی روئی کو تو وہ ایسے ہلکے ہلکے تھپ تھپا کر اندر بٹھا رہی تھی جیسے شیلا کی چوٹوں کو سہلا رہی ہو۔

وہ اپنے آپ سے بے انتہا خوش تھی، اور خود کو بڑی دریا دل، منصف مزاج اور ذی فہم محسوس کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک شیلا کے پلنگ کے قریب ٹھٹکی کھڑی رہی، اور ایک خوشگوار بے خیالی میں اپنے ہونٹوں پر انگلیاں پھراتی رہی۔ لیکن جب اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے بستر پر بھی شیلا کی قربت سے اتنی ہی اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتی ہے تو اُس نے اپنے پیروں اور ٹانگوں کو اکٹھا کیا، اور مڑ مڑ کر شیلا کے تکیے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے پلنگ پر آ بیٹھی۔ وہ شیلا کے تصوّر کو جس کے دم سے

کمرہ منوّر ہوگیا تھا، کسی قیمت پر بھی الگ کرنے کو تیّار نہیں تھی؛ اُس نے اپنی کہنیوں کو چھوٹے سے بچّے کی طرح گود میں بھینچ رکھا تھا گویا وہ منجمد ہوکر اُن کی شکل میں تبدیل ہوگیا ہے، یا وہ اُن میں چپک گیا ہے اور اُس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی ہوا اُسے چھُٹا دے گی. اس تین سال کے عرصے میں جاڑے کی سختیاں بھی اُس کے دل میں کمرے کے دروازوں میں کواڑ لگے ہونے کی ایسی زبردست تمنّا پیدا نہ کرسکی تھیں جیسی کہ وہ اس وقت محسوس کررہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کم سے کم دو گھنٹے تو اور لڑکیاں اندر نہ آئیں، اور وہ بغیر کسی مداخلت کے شیلا کے تصوّر کو نئے نئے رنگ اختیار کرتے ہوئے دیکھتی رہے، اُسے اپنے دل میں کلکاریاں مارتے ہوئے سُنے، اُس کے خشک بکھرے ہوئے بال نکھر جائیں، اُس کی مَیل سے اَٹی ہوئی گردن اور چہرہ چمکنے لگیں، اور شیلا اس کی محبّت کی پوری طرح مستحق بن جائے تاکہ جو کوئی اُنہیں دیکھے وہ یہی کہہ اُٹھے "بس صاف تو یہ دونوں بہنیں رہتی ہیں!" اور اپنی بیٹیوں کے لئے اُنہیں مثالی نمونہ بتائے، "اُن دونوں بہنوں کو نہیں دیکھتی ہو؟" ____ اور شیلا کی ان ترقیوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کا دل باغ باغ ہوجاتے۔

لیکن ساری تمنّاؤں کی بطالت کے ثبوت میں زہر خند اتفاق، کی ٹاپیں باہر کھڑنجے پر گونج رہی تھیں. نہ صرف یہ بلکہ اگلے ہی لمحے میں کمپاؤنڈ کے لیمپ کی روشنی غائب ہوگئی، اور دروازے کی تاریکی میں سے آنے والی آوازوں نے اُسکے آپہونچنے کی منادی کردی: "فیتھ! فیتھ! کدھر ہے؟" وہ آوازیں کہہ رہی تھیں. اور پھر جھنجھلاہٹ کے ساتھ، "کہاں جا چھپی رہی؟"

لیکن اُس نے رُوڈا کو اس وقت تک نہ پہچانا جب تک کہ رُوڈا نے اُس پر گھٹنا ٹکاکر اُس کے کندھوں کو نہ ہلا ڈالا: "یہاں آ چھپیں!" وہ کہہ رہی تھی "اور ہم ڈھونڈتے رہے ہیں ساری دُنیا میں!"

گو روڈا نے اُس کی گود میں ہل چل ڈال دی تھی، مگر وہ اب بھی بچے کو ہاتھ سے دینے پر راضی نہ تھی۔ "ہاں، میں وہ ذرا ـــ" اُس نے اپنی کہنیوں کو دوبارہ چھپاتے ہوئے بغیر کچھ سوچے جلدی سے بولنا شروع کر دیا تاکہ روڈا کا دھیان بٹ جائے اور وہ اُس کی گود کے راز سے واقف ہونے کی کوشش نہ کرے۔

"یہاں کیوں پڑی ہے تو اندھیرے میں؟ ذرا باہر وا ہر نکل۔ جی نہیں گھبراتا تیرا؟ ....اچھا! اب میں سمجھی!" روڈا نے ایک پُرجوش، فاتحانہ چیخ کے ساتھ کہا۔ "تو کچھ کھا رہی تھی یہاں چھپا کے اندھیرے میں!.... کیوں ری ندیدی؟ چرا لی ہوگی تو نے آج دوپہر خوانچے والے سے؟ ہمیں بتا دیتی تو کیا ہم کھا جاتے؟"

یہ الزام ان کریہہ ترین دھبوں میں سے تھا جن کا نشان تک فیتھ کو اپنے دامن پر گوارا نہ تھا۔ مدافعت کی فوری ضرورت نے اُسے بالکل بیدار کر دیا، اور اس لئے روڈا سے زیادہ ہواؤں اور کائنات کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اخلاقی پاکیزگی کے لہجے میں، جس میں روڈا کی فطری بدیقینی اور بدگمانی کی شکایت بھی ملی ہوئی تھی، کہا: "لو بھلا میں کھا رہی تھی؟ میں تو بستر کرنے آئی تھی۔"

"بستر کرنے آئی تھی۔" فیتھ کے بیان کو دہراتے ہوئے روڈا کو اسکے خلاف ایک دلیل سوجھ گئی تھی۔ "اتنی دیر میں ہوتا ہوگا بستر؟ چار گھنٹے میں؟"

"چار گھنٹے ہوئے ہیں مجھے؟ ابھی تو آ رہی ہوں روٹی کھا کے کچن سے۔ تمہیں کیا خبر! کام نہ دھام، بس اپنے گُدگڑوں سے مطلب!"

"جیسے میں کرتی نہیں ہوں کام؟" اُسے خود معلوم تھا کہ یہ ایک مستحکم مورچہ نہیں ہے۔

"بڑا اچھا کرتی ہیں کام! کچی پکی روٹیاں تھوپ کے رکھ دیں، یہ ہو گیا کام!"

"اچھا چلو۔" روڈا کی یہ ایک کمزوری تھی کہ وہ کسی جھگڑے کو دیر تک نہ چلا سکتی تھی،

اور وہ اب اس قضیے سے جو اس کی سدا بہار خوش مزاجی میں مخل ہو رہا تھا تنگ آ چلی تھی۔ "تم بھی بڑی بدتمیز ہو۔ اس کا کیا جھگڑا؟" اور فینتھ کو یقین دلانے کے لئے کہ اس کا مقصد کبھی بھی اس پر الزام لگانا نہیں تھا، اس نے ارادی طور پر لہجے میں مذاق پیدا کرتے ہوئے کہا "اب بتا دو تم کیا کھا رہی تھیں؟"

اب کے تو فینتھ اس پر برس پڑنا چاہتی تھی، مگر روڈا کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ہنسی نے اس کے شبہ کو مٹا دیا، اور اس نے اپنی غلط فہمی اور جلد بازی پر محجوب ہو کر روڈا کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہا "بڑی بڑی چیزیں کھا رہی تھی ہیں، تجھے تو نام بھی نہ معلوم ہوں گے ان کے" اور پھر اسے وہ بات یاد آ گئی جسے وہ روڈا سے کہنے کو صبح سے بے چین ہو رہی تھی، اور ابھی تک موقع نہ پا سکی تھی "ایک اور بات بھی معلوم ہے تجھے؟" اس نے روڈا کی دلچسپی بھڑکانے کے لئے پوچھا جس کی دلچسپی ہر چیز میں دوسروں سے ایسی ہی جداگانہ اور غیر معمولی ہوتی تھی جیسے اس کی غیر متناسب فربہی۔

جیسا کہ پہلے سے بتایا جا سکتا تھا، روڈا کو نہیں معلوم تھا۔

"رات بڑا مزا آیا" فینتھ نے وہ تعجب خیز بات سنانی شروع کی "میری جو آنکھ کھلی سوتے سوتے تو کچھ کٹر کٹر کی آواز آئی۔ اب میں اس انتظار میں کہ یہ سمجھ سکوں کیا چیز ہے۔ کبھی تو میں یہ سوچوں کہ باہر کوئی کتا ہے، اور کبھی یہ کہ چوہا ہے۔ غور سے جو سنا میں نے تو ہیولا کے پلنگ کی طرف سے آتی وہی معلوم دی آواز۔ پہلے تو مجھے اندھیرے میں پتہ نہ چلا، پھر جو دیکھوں تو بسکٹ کھا رہی ہیں مس سابینا! تکیے میں چھپا رکھے تھے۔ آپ نے بسکٹ اور چپکے چپکے نکال کے کٹر کٹر کر رہی تھیں۔ کل اس کے گھر سے کوئی آدمی آیا تھا۔ وہ اسے کلاس میں سے بلا کے لے گیا تھا۔ وہی دے گیا ہوگا بسکٹ۔ آپ نے رکھ لئے چھپا کے مجھ سے، میں کہ رات کو کھاؤں گی۔۔۔۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ اٹھ بیٹھوں

اور کہوں کہ ہیولا، اکیلے ہی اکیلے ادھر میں نے سوچا ہٹاؤ . . . تو جاگتی ہوتی کہیں اُس وقت، روڈا!

"مجھے نہ جگا لیا اُسی وقت!" روڈا نے مصنوعی افسوس کے ساتھ کہا۔ "اچھا ایک کام کرو۔ آج جب ہیولا ہو جائے تو اُسکے تکیے کی تلاشی لو!"

روڈا کے ساتھ اتنی دُور جانا فیتھ کے مان کا نہ تھا، بلکہ اُسے تو اس میں بھی شبہ تھا کہ روڈا جسے آٹھ بجے کے بعد اپنے سر پیر کا بھی ہوش نہیں رہتا، خود اتنی دُور جا سکتی ہے۔ اُس کے لئے چھانٹ کافی تھی: اس لئے اُس نے ذرا نیم سنجیدگی سے ہامی بھر لی۔ "ہاں ہاں، ضرور۔ رات کو!"

روڈا کی چلبلی روح اب اس موضوع سے بالکل سیر ہو چکی تھی۔ روح تو الگ رہی، اس دو منٹ کے قرار سے وہ اپنے جسم تک کو زنگ آلود سا محسوس کرنے لگی تھی، اپنی رگوں میں خون کو دوبارہ تیز کرنے کے لئے اُس نے فیتھ کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا: "رات کی رات کو دیکھی جائے گی!" اُس نے ایسے بے چینی سے کہا جیسے فیتھ اپنی پیش کی ہوئی تجویز پر فوراً عمل درآمد کرانے کے لئے بیکار ضد کر رہی ہو۔ "بس اب اُٹھو، چلو باہر!"

فیتھ کو معلوم نہیں تھا کہ خود اُس کا دل کیا چاہتا ہے۔ یوں تو اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن وہ اتنی دیر انتظار کرنا چاہتی تھی کہ اُسکے دل میں باہر جانے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ اپنے آپ کو اتنا وقفہ دینے کیلئے اُس نے آواز کو غیر دلچسپ بناتے ہوئے پوچھا: "کیا کرینگے اب باہر جاکے؟ رات تو ہو گئی!"

لیکن روڈا ایسی چنگاری نہیں تھی جو پہلے ہی چھینٹے میں بجھ جاتی۔ اُس نے فیتھ کو پہلے سے بھی دُگنے جوش و خروش کے ساتھ جھنجھوڑ ڈالا: "رات ہو گئی ہے تو کیا ہے؟ چل باہر ٹہلیں گے!" اور جب اُس نے فیتھ کے اعضا میں کوئی حرکت نہ پائی تو اپنی اسٹیر

سے ایک زیادہ للچانے والی ترغیب بھی نکال لی: "شیریں اور آلوی پیپل کی طرف گئی ہیں ابھی ابھی۔ چل اُن کے پیچھے چلیں، دیکھیں کیا باتیں کر رہی ہیں!" اور اُس نے محض ترغیب کو کافی نہ سمجھتے ہوئے ایک دھمکی کا بھی اضافہ کر دیا: "نہ چلی تو پھر دیکھیو، نوچ لوں گی!"

لیکن درحقیقت روڈا کو انتہائی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اُس کے ساتھ ہنسنے بولنے سے فلیتھ کی تھکن اُتر سی گئی تھی، اور وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا اور تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔ اب تو اُس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ باہر ہوا میں ٹہلے جو اُس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کو تو ضرور ٹھنڈک سے جما دے گی مگر دل میں انبساط کی لہریں بھی دوڑا دے گی، اور روڈا کے ساتھ ٹہل ٹہل کر باتیں کرے، گھاس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ لگائے، لڑکیوں کو اُکسائے کہ چل کر لنگڑی چماری کو چھیڑیں۔ اس لئے وہ روڈا کی دھمکی پر ہنستی اور چہکتی ہوئی فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی، مگر روڈا کو ممنون کرنے کے لئے اُس نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا: "دیر بہت ہو گئی ہے، خیر چلو!"

جب وہ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے سائبان سے باہر نکلیں تو آنکھیں بند کر کے زندگی کی چہل پہل اور ریل پیل میں کود پڑنے کا عزم اُن کے خون میں تلملا رہا تھا۔ شام کی ہلکی پھلکی اور نتھری ہوئی ہوا کا، جس نے ابھی تک جاڑے کی راتوں کی اپنے اندر غلطاں و پیچاں رہنے والی درشتی اور نشتریت جذب نہیں کی تھی، فرحت بخش سانس اُن کی ناکوں اور چہروں پر لگ رہا تھا، اور ریڑھ کی ہڈی کے سہارے سہانے سے طور پر پھیلا جا رہا تھا۔ حالانکہ کھمبے کے گرد روشنی نے آدھی رات کا سماں کر رکھا تھا، اور رات کے آبنوسی آسمان پر تارے غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ ٹمٹما رہے تھے، لیکن کچھ حصّے پر ابھی تک شام کی معصوم اور یاسمینی روشنی کے نشانات

باقی تھے۔ بلکہ بجلی کی زرد اور اکھڑ روشنی میں سے تو ایسی کراہیت انگیز تنبیہ رِس رہی تھی کہ دل خود بخود ہٹ کر شام کی نزہتوں کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ فضا میں ایک وجد آور نغمے کی مبہم سرسراہٹ تھی، اور زندگی کی رنگ رلیوں میں گھل مل جانے کا ملائم مگر مضطرب بلاوا۔ جسم پر خالی فراکوں اور برہنہ پنڈلیوں کے باوجود دونوں لڑکیاں ذرا بھی نہ سکڑ رہی تھیں، اس کے بجائے انہیں اپنے اعضا پھیلتے اور بڑھتے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ گو فیتھ کے ساتھ دو قدم ہی تیز چلنے سے روڈا کا سانس پھول گیا تھا، مگر ایک مزیدار شام کی بے داغ مسرّتوں کی توقع اُسے ڈھیلا نہ پڑنے دیتی تھی۔ فضا میں ہر طرف کسی لڑکی کے پھسل کر گر پڑنے پر قہقہے، کسی کے چور بن جانے پر خوشی کی چیخیں، "اینا، مینا، مونا، مائنٹ" یا "بڈی، گڈی، گو، آوٹ گو یو!" کی آوازیں چلبلے بچوں کی طرح تڑپ رہی تھیں جنہیں سُن سُن کر فیتھ بیقرار ہوتی جا رہی تھی کہ کسی طرح جلدی سے دوڑ کر کسی گروہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن ابھی وہ مسرّت کے اُمید افزا پیچ رنگ پانیوں میں ٹخنوں ٹخنوں بھی نہ پہونچنے پائی تھی کہ دفعتاً اُس نے ایک مبہوت کن صدمے کے ساتھ دیکھا کہ درحقیقت اُس کے پیروں کے نیچے صرف خوش آیند لیکن بے جان اور بے فیض ریت کی لہریں تھیں۔ شام کی درخشانی میں، ہوا کی لطافت اور نرمی میں ایک بلند و بالا علیحدگی تھی، اور عظیم جدائیوں کی سی خوشبو بسی ہوئی تھی جس کی پہلی ہی مہک سے فیتھ کی طفلانہ خوشی کملا گئی۔ اُسکے چاروں طرف منقّش کے نیلے ٹکڑے فضا میں بہہ رہے تھے، مگر اُنہیں ہاتھوں سے جمع کر کے اپنے قریب کر لینے کا خیال دل میں آتے ہی وہ اتنی دُور ہٹتے معلوم ہوتے تھے کہ فیتھ کو جھینپ کر اپنے کندھے تک سکیڑ لینے پڑتے تھے۔ لڑکیوں کے قریب پہونچنے تک اُس کا پہلا ارادہ بجھ چکا تھا۔ مختلف گروہوں کی "یہاں آؤ، یہاں آؤ!" کو چند لمحے بے اعتنائی سے سُننے کے بعد وہ میدان کے خالی حصّے کی طرف مڑ گئی اور

اُس کی باہوں کی نکیل اور اُس کی پُر رمز خاموشی نے رووڈا کو بھی بغیر کسی احتجاج کے اُدھر پھیر دیا۔ ممکن ہے کہ وہ اُسے روکنے کی خفیف سی کوشش کرتی، مگر فیتھ کی مختصر اور سنجیدہ "اِدھر آؤ" نے اُسے چُپ کر دیا۔ خُون کے مُنھ پڑتے ہی فیتھ کے ہاتھ سردی سے جمنے شروع ہو گئے تھے، اور جاڑا برف کی پٹیوں کی طرح اُس کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بعض لڑکیاں تو صرف ہلکا سا بغیر باہوں کا زیر جامہ ہی پہنے کھیل رہی تھیں، اور معمولی چھوٹے کوٹ سے زیادہ تو کسی کے پاس بھی نہ تھا، لیکن اُسے اپنا چھوٹا کوٹ اتنا حقیر اور مضحکہ خیز حد تک بے مصرف معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے لینے کیلئے اندر جانا اُس کے خیال میں ایک فضول تکلیف تھی۔ وہ اِدھر اس خیال سے آئی تھی کہ شاید گھاس کی بھیگی بھیگی خوشبو اُسے آہستہ آہستہ اپنا دوست بنا لے، اور تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیوں کے پاس لوٹ آنے کے قابل ہو جائے، مگر کوئی یہاں آسمان دُور تھوڑے سے تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ ہوا اُس کی داہنی آنکھ کے نیچے ہلکے ہلکے گدگداتی ہوئی پھسلے، مگر وہ وہیں سے بچ بچ کر نکل رہی تھی۔ لمبی اور سیدھی ٹھنڈی سڑک اور سینما ہال کی چمکدار دیواروں کی طرح یہاں کی ہر چیز، یہاں تک کہ اندھیرا اور ہوا بھی صاف اور بے عیب ترشی ہوئی، ہموار، منظم و مرتب، بے غرض، پُر تمکنت، اور غیر شخصی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ ان سب چیزوں کے ساتھ یک جان و یک قالب ہو جائے، مگر اُن کی آبدار، نہ مُڑنے والی ہمواری میں اُس کے جسم اور رُوح کے پیچ و خم سے ہم آہنگ ہو سکنے کی کہاں گنجائش تھی۔ اگر وہ چار سال تک روزانہ سینما کی رنگین عمارت کے سامنے سے گذرتی رہتی تب بھی وہاں کی روشنیاں، تصویریں، ہمیشہ دھڑکتی رہنے والی سڑک، اُس کی منجمد لیکن متحرک بھیڑ ——— کوئی چیز بھی اسکی ضرورت محسوس نہ کرتی، اور وہ سارے ہنگامے لاعلمی کے ساتھ، بے پروائی کے ساتھ رواں رہتے۔ اس اندھیرے سے وہ دوسرا ——— گھر کا ——— اندھیرا کتنا مختلف تھا۔

وہ صاف ترشی ہوئی رُت کی شکل میں نہیں، بلکہ آوارہ مزاج بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح
لاابالیانہ پن سے رنگتا رُکتا، گھٹتا بڑھتا منڈلاتا رہتا تھا۔ کبھی اس دروازے میں سے ہوکر
اندر جا پہونچا، کبھی اُس دروازے میں سے باہر نکل آیا، کبھی باورچی خانے میں جا گھسا۔
——— جیسے خاندان کا زندہ دل رُکن جو دو باتیں یہاں کہے اور دو وہاں۔ اس اندھیر
اور اُجالے کی لازم و ملزوم روشنی میں یہاں کی طرح کوئی معاندت نہ تھی۔ تھوڑا سا
اُجالا رہتا تھا، تھوڑا سا اندھیرا۔ وہاں کی ہر چیز اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی، ہر
چیز اس پر منحصر تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے چلے آنے کے بعد اندھیرے نے اپنے
آپ کو سونا سونا پایا ہوگا۔ وہاں کے خصوصاً کتنے لچک دار اور موم جیسے نرم تھے! وہ کسی
شکایت کے بغیر اس کے مزاج کی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ بدل سکتے تھے۔ دیواریں
اس کی خواہش کے مطابق ٹیڑھی یا سیدھی ہو جاتی تھیں، نیم کا گدرا اتنا جھک آتا تھا کہ
اگر وہ چاہتی تو اُسے ہاتھوں سے پکڑ کے لٹک جاتی۔ یہاں تو وہ مصالحت کی شرط
کے طور پر خوش پیش کر رہی تھی۔ دیواروں میں ذرا سا خم پیدا ہو جاتے، اُنکا پلاسٹر
ذرا ایک جگہ سے کھرچ جاتے، کھمبا مڑ جاتے، کم سے کم ذرا سا جھک ہی جاتے۔ مگر یہ چیزیں
اپنی سختی اور باقاعدگی و لاپروائی کو زندگی کے تحفظ سلامت رکھنے پر اتنی منحصر تھیں کہ وہ اس
قسم کی کوئی شرط بھی سننے کو تیار نہ تھیں۔ ورنہ انہیں مصالحت کی ضرورت ہی کیا تھی!
نتیجہ تو یہاں تک جا پہنچی تھی کہ ان سب کی بڑائی مان کر ان کا خیال ہی چھوڑ دے،
اور گھر کے اندھیرے میں جا بسے ——— اپنے آپ کو اور رہی اس لڑ آبادی کو اپنے تخیل،
اپنے خوابوں، اپنی ہستی کے پھیلاؤ کی شدت سے گھیر لے۔ ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ بنا لے،
مگر یہاں تو اس شہر کے اندھیرے کی داشتہ آمریت تھی، اُس کی قلمرو میں رہتے ہوئے
کہیں اور جا بسنا ممکن نہیں تھا۔ اس زمین پر پیر کھڑا ہوئے والا اس شراب میں گرفتار
تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھے کہ اس کے گرد کیا ہے۔ اور نتیجے کے گرد کیا تھا؟ وہی

غیر شخصی اندھیرا اور عمارتیں، وہی برقانی روشنی، وہی بیزار کن شور و شغب، اور لا یعنی قہقہے، وہی پیڑوں کے سایوں میں چھپتے ہوئے لڑکیوں کے جوڑے! فلیتھ کو دو دو لڑکیوں کے یوں چوروں کی طرح چھپتے ہوئے ساتھ ساتھ پھرنے، اور سر ہلا ہلا کر شرماتے ہوئے نیچی آوازمیں باتیں کرنے سے زیادہ لغو، مہمل اور تھکا دینے والی بات اور کوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ جب کبھی وہ ایسی دو دو لڑکیوں میں گھر جاتی تھی تو اُسے سارے وقت اپنے حلق میں ایک تلخ شیرینی کا احساس ہوتا رہتا تھا جس سے اُس کی زبان بالکل سیٹھی سیٹھی ہوجاتی تھی اور اُسے بار بار تھوکنا پڑتا تھا۔ اور نہ اُسے دوسری لڑکیوں کی طرح سڑک کے قریب گھومتے رہنے یا ٹھٹک کر کھڑے ہوجانے میں کوئی خاص لطف آتا تھا جب وہ لڑکوں کو اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مضحکہ خیز چھڑیوں کی طرح تن تن کر چلتے، یا لڑکیوں کو دکھانے کے لئے ندیدے پن سے سگرٹ پیتے دیکھتی، تو اُسے اُن کی ذہنی پسپا ہٹ پر خود اپنے آپ سے شرم آنے لگتی تھی، اور وہ انتہائی کراہیت کے ساتھ اُدھر سے منہ پھیر لیتی تھی۔ نہ سائیکل پر پیچھے دیکھتے ہوئے چلنے اور تانگوں سے ٹکرا جانے کا خطرہ مول لینے میں اُسے کوئی فہم و فراست کی معراج نظر آتی تھی۔ ساری لڑکیاں ایسی ہی سستی اور چھچھوری چیزوں کی دُھن میں پڑی رہتی تھیں، اور اُس نے اِن میں سے کسی کو بھی اپنی طرح دوپہر کو گڑھل کے سائے میں گھنٹوں خاموش بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ وہ روڈا کے سوا کسی کے کبھی گلے میں باہیں نہ ڈالتی تھی، اور وہ بھی روڈا کی زبردستی سے۔ روڈا کے پلپلے اور اپنے کو دوسروں کی نگاہوں پر ٹھونسنے والے سینے کے چھو جانے سے تو وہ ہمیشہ گھبرا یا کرتی تھی، اور اس وقت تو وہ اُس سے ایسی بچ رہی تھی جیسے روڈا نے اپنی فراک میں گیلی اور گلگلی چھچھوندریں بھر رکھی ہوں۔ لیکن روڈا کو اس وقت نہ معلوم کیا ہوگیا تھا کہ اُس کی الگ رہنے کی کوششوں کے باوجود وہ اُس سے لپٹی جارہی تھی اور فلیتھ کو اپنے گلے میں سے ہاتھ نہ نکالنے دیتی تھی۔۔۔ اس لڑکیوں سے بھرے ہوئے میدان میں،

روڈا کی باہنہ کے نیچے، وہ اکیلی تھی ـــــ بے طرح اکیلی۔ نہ کوئی اُس کا دمساز تھا نہ کوئی محرمِ راز، نہ کوئی اُس کی تنہائیوں کو کم کرنے والا۔ بس وہ اکیلی تھی ـــــ غیر شخصیت کے بے پناہ نرغے میں اکیلی! اگر اُس کے درد کا تھوڑا بہت مداوا ـــــ بلکہ افیون ـــــ کوئی ہو سکتا تھا تو یہ کہ وہ اندھیرے کی اُڑان کو دیکھتی رہے جو اپنی بے اعتنائی میں اتنا ظالم تھا کہ ضرر رساں بھی نہ رہا تھا۔ اندھیرے کے گالوں کی ایک قطار ہوا پر آہستہ آہستہ ہارسنگار کی جھاڑیوں کی طرف کھسک رہی تھی، اور اُن کے اُدھر جا کر غائب ہو جاتی تھی۔ کیوں نہ وہ اندھیرے کے پیچھے پیچھے ہارسنگار کی جھاڑیوں کے اُدھر چلی جائے؟ کاش وہ جا سکتی! ہارسنگار کی جھاڑیوں کے پیچھے اُس کے ساتھ نہ معلوم کیا واقع ہو۔ ـــــ شاید کچھ بھی واقع نہ ہو، شاید وہاں "کچھ نہیں" کی ابدیتیں پھیلی ہوں ـــــ شاید ہارسنگار کی جھاڑیوں کے اُدھر بے نام اور بے کنار گہرائیاں ہوں جن میں غرق ہو کر اندھیرا وہاں کی لامحدود وسعتوں پر حیرت کرنا بھی بھول جاتا ہو۔ بس وہ ایک لمبا کوٹ پہنے، متانت سے قدم اُٹھاتی، اندھیرے کے پیچھے روانہ ہو جائے؛ اور اگر روڈا روکنے کی کوشش کرے تو وہ بغیر سر موڑے ہاتھ ہلا کر صرف تین فیصلہ کُن لفظ کہہ دے، "میں جا رہی ہوں"؛ اور روڈا مبہوت و بے حرکت کھڑی کی کھڑی رہ جائے۔ کاش کہ یہ سب ہو سکے! ... وہ عزم اور بُزدلی کے درمیان ایک بال جیسے باریک تار پر کھڑی تھی، لیکن وہ اس تار کے شعبدے سے خُوب آگاہ تھی کیونکہ ساری کی ساری کشش ثقل بُزدلی ہی کی طرف تھی۔

فیتھ اپنی واروکے گھونٹ کے گھونٹ چڑھاتی رہی تھی، اور وہ مجرّب بھی ثابت ہوئی تھی۔ جب اُس کا سر تھکن اور گرانی سے پھٹنے کے قریب ہو گیا تو یکایک اس اندھیرے کی فولادی دیواریں گل کر بیٹھنے لگیں، اور وہ اُس کے شگافوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے دل پسند اندھیرے میں جا پہونچی جس کے سائے میں وہاں کے مانوس و محبوب

دروازے، دالان، نیم کا پیڑ اور خمدار دیواریں اُسے میٹھی یادوں کی لوریاں دے دے کر جھولا جھلانے لگے۔ اس دوران میں، خواہ اُسے پتہ نہ چلا ہو، لڑکیوں کی آوازیں بھرّاتی چلی گئی تھیں، اُن کے قہقہے کم اور بہادتی ہوتے گئے تھے، کھمبے کی برفانی روشنی میں بخار کی آنکھوں کی سُرخی آگئی تھی۔ مقیّش کے ٹکڑے بالکل غائب ہوگئے تھے، اور رات کی سردی اور تاریکی متوحش تن بنتی جا رہی تھی۔ روڈا نے کئی مرتبہ باتیں شروع کرنے کا ڈھب ڈالا تھا، مگر فیتھ نے اُسے ہوں ہاں میں اُڑا دیا تھا۔ آخر فیتھ کی بے وجہ مگر نہ ٹوٹنے والی خاموشی نے اُسے ہرا دیا، اور اُسکے دل میں فیتھ کیلئے ایسی ہمدردی اور سخاوت کی سی لہر اُٹھی کہ اِس وقت اُسے پریشان نہ کرنے کا ارادہ کرکے وہ بھی چُپ ہوگئی۔ لیکن کون جانے پھولدار جھاڑیوں کے نیچے تالاب کتنا گہرا ہے۔

ابھی آٹھ بجنے بھی نہ پائے تھے کہ میٹرن نے اپنے کمرے سے نکل کر لڑکیوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔ ممکن تھا کہ آج فیتھ کی میٹرن سے جھوڑ ہو جاتی، کیونکہ اور بڑی لڑکیوں کی طرح اُسے بھی یہ پسند نہ تھا کہ چھوٹی لڑکیوں کے سامنے اُسے کچھ کہا جائے، بلکہ شاید وہ تو اُسے بالکل ہی پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن روڈا نے میٹرن کی آواز سُن لی تھی، اور اُس نے فوراً ہی فیتھ کو خبردار کر دیا۔ "دیکھ بڑھیا نکل آئی، چل اندر چلیں!" فیتھ چل تو پڑی مگر اُس کی آنکھیں ایسے بند ہوتی جا رہی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی بڑی گہری نیند سو کر اُٹھی ہو۔ روڈا نے اُس سے ذرا قدم بڑھانے کو کہا بھی، کیونکہ ممکن تھا راستے میں میٹرن سے مڈبھیڑ ہو جائے اور وہ کچھ کہنے لگے، لیکن وہ خود بھی چاہتی تو شاید اُس وقت قدم نہ بڑھا سکتی۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ اُسے کتنی سردی لگ رہی تھی۔ وہ تو اپنی بے خیالی میں کھونٹی سے کوٹ اُتار کر پہننے لگی تھی، مگر روڈا نے اُسے یاد دلایا کہ اب تو لیٹنے کا وقت آگیا تھا، اب کوٹ پہننے سے کیا فائدہ۔ میٹرن اب بھی باہر

چیخ چلا رہی تھی، اور کھیل سے لوٹتی ہوئی لڑکیوں کے جوتوں کی آوازیں سائبان اور کمروں کے دروازوں سے آ رہی تھیں۔ جو لڑکیاں آ پہونچی تھیں وہ جھٹک جھٹک کر پیروں سے جوتے اُتار رہی تھیں اور وہ کھٹ کھٹ فرش پر گر رہے تھے۔ ہما بہو والے کمرے میں زور زور سے پلنگ گھسیٹے جا رہے تھے، اور آخری کمرے میں چند لڑکیاں جمع ہو کر بوڑھی میٹرن کی نقلیں اُتار رہی تھیں، اور کمرے بھر میں اُچھل اُچھل کر ہنس رہی تھیں۔ جیسے میٹرن کی تھرتھراتی ہوئی آوازیں گھسیٹ گھسیٹ کر کہہ رہی تھی: "آٹھ کا ٹائم ہو گیا، ہم کہہ رہے ہیں، اور ابھی تک دوڑ لگ رہی ہے۔ نو بجا ہو گیا تو رونا پھر میم صاحب میم صاحب کریں گے۔"

"تم تو کر چکی ہو گی اپنا بستر؟" روڈا نے اپنے بچھونے کا کونا کھینچ کر بے ترتیبی سے پلٹتے ہوئے طنز کے ساتھ پوچھا۔

فینتھ نے اس میں اپنی مستعدی اور صفائی کی تعریف محسوس کرتے ہوئے کہا:

"اور کیا میں تیری طرح ہوں؟" اور اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ پیدا ہو گئی، خواہ وہ مرجھائی ہوئی سی ہی۔

"ارے ہمیں کون سا انعام لینا ہے۔" روڈا نے اسکے عملی ثبوت میں تکیہ نیچے گرا کر جھاڑے بغیر بستر پر رکھتے ہوئے کہا، "ہمیں تو پڑ رہنے سے مطلب۔" اور اسکے بعد اُس نے ایسا مطمئن قہقہہ لگایا جس نے فینتھ کے آدرش کو خود اُس کی نظروں میں کم سے کم ایک لمحے کیلئے مضحکہ خیز بنا دیا۔

اپنا بستر کھول چکنے کے بعد روڈا اُس پر لڑھکنے ہی والی تھی کہ فینتھ نے اُسے روکا۔ وہ اندھیرے میں لیٹنے سے گھبرا رہی تھی، اور چاہتی تھی کہ کھمبے کی روشنی کم سے کم اُسے نظر ہی آتی رہے۔ "ذرا ٹھہر، ٹھہر!" اُس نے روڈا کو روک کر اُٹھتے ہوئے کہا: "میرا پلنگ پکڑوا دے دروازے کے قریب۔"

"دروازے کے قریب؟" فیتھ کی منطق اُس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ "ہوا آئے گی یہاں تو پھر رپھرر۔ جاڑا نہ لگے گا تجھے؟"

"تجھے کیا، تو پکڑوا دے۔"

روڈا نے اسے جاڑے سے بھی زیادہ ڈرنے کی چیز سے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اور یہ ہیولا کا پلنگ؟ یہ تو یہاں اَڑ رہا ہے۔"

"ذرا پیچھے کو کھسکا دے اِسے۔"

"پیچھے کو کھسکا دے؟" روڈا نے فیتھ کے غبی پن پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "اور ہیولا جو لڑے گی آ کے؟"

"لڑے گی تو لڑنے دے۔" اس وقت فیتھ ساری باتوں کو مچھروں کی طرح بے پروائی سے اُڑا دینے پر مُصر تھی۔ "تو پلنگ پکڑوا۔"

"لے میں پکڑوا رہی ہوں۔" روڈا نے ہیولا کے پلنگ کو ٹانگ سے پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا، "میرا کیا ہرج ہے۔ میں نہیں جانتی ہوں جو لڑائی وڑائی ہو۔"

"تجھے کون جنوا رہا ہے؟" فیتھ اپنی دُھن میں مست تھی۔ "تجھ سے تو نہیں ہوگی لڑائی؟"

فیتھ اور روڈا اپنے بستروں پر لیٹ کر تعجب کر رہی تھیں کہ شیلا اور ویلیری ابھی تک نہیں آئیں کہ باہر سے اُن کے ننگے پیروں کی دھب دھب اور شیلا کے دن رات کے وظیفے کے بولوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ "کیا ہوا بھئی کیا ہوا؟ للا ہوا۔" اور اگلے چند لمحوں کے دوران میں ہی "پا، پگّی، پوّا، پوڑی، پیپا!" دروازے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں پہنچ کر بھی شیلا رُکی نہیں؛ اُس نے پورے انہماک سے اپنی قنوطی پھر سے شروع کر دی، "کہاں چلے بھئی، کہاں چلے؟" گویا اُس کے ہر لفظ کے دھماکے سے اندھیرے میں ایک سوراخ ہو جائے گا اور وہ اِس روشنی میں اپنا پلنگ ڈھونڈ لے گی۔ اور اُس نے اُس وقت تک سانس نہیں لیا جب تک کہ چوکی پر للا ہونے کی وجہ سے

زبیدہ لینے کے لئے بازار جانے کی ضرورت کے بیان سے لے کر للّا کے رونے کی آوازوں تک نہ پہونچ گئی۔ فیتھ کو، جس کے کان اب تک پھٹ چلے تھے، خیال بھی آیا کہ شیلا کو بتا دے کہ اُس نے بستر بچھا دیا ہے، مگر اُسے اندیشہ تھا کہ نرمی کے ایسے بے موقع اظہار سے شیلا کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔ اس لئے اُس نے اپنی آواز میں حق اور عدل کی سختی پیدا کرتے ہوئے پوچھا "کچھ بچھونے وچھونے کی بھی فکر ہے کہ نہیں؟ اب آئی ہیں بارہ بجے۔"

"اب بارہ بجے ہوں گے؟" شیلا نے ہیولا کے پلنگ کی ٹکّر سے بچتے ہوئے کہا "ابھی تو سب باہر پھر رہے ہیں، دیکھ لو چل کے۔"

"دیکھ لو چل کے! کیا دیکھ لو چل کے؟" فیتھ کوئی اس سے بھی سخت بات کہنا چاہتی تھی، مگر اُسے تربیتِ اطفال کا یہ زرّیں اُصول اچھی طرح یاد تھا کہ چھوٹوں کے مُنہ نہ لگنا چاہیئے، کیونکہ اس سے وہ بدتمیز اور گستاخ ہو جاتے ہیں اور پھر کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ غصّہ پی گئی، لیکن پھر بھی اُس نے اپنی آواز میں احتیاط کے ساتھ خفگی ملاتے ہوئے گناہگاروں پر اپنے خاص الطاف و عنایت کا انکشاف کیا "چلو خیر، چل کے لیٹو۔ آج تو میں نے کر دیا ہے تمہارا بستر!" ـــــ جس میں یہ زیرِ لبی دھمکی بھی پوشیدہ تھی کہ یہ آخری مرتبہ تھا۔

اپنا بستر واقعی بچھا ہوا پا کر شیلا کو ایسا قلبی اطمینان ہوا کہ اُس نے مستقبل کے بارے میں فیتھ کی دھمکی سے بے پروا بننے کے لئے اپنا چرخا پھر چلا دیا۔ وہ کھڑی ہوئی اپنے پلنگ کے بیچ میں زور زور سے پیر مار رہی تھی اور لہک لہک کر کہہ رہی تھی "نام کیا بھئی؟ چِنگ مُنگیا" ـــــ گویا اس مولودِ مسعود پر سب سے زیادہ خوشی اُسے ہوئی تھی، اور خوشی کے اظہار کا اِس سے زیادہ موزوں طریقہ ممکن نہ تھا۔ لیکن ویلری، جو ہمیشہ کی طرح شیلا کے بعد داخل ہوئی تھی، ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

"شیلا کا بچھونا تو نے بکھر دیا تھا نینہ؟" روڈا نے ویلری کو پلنگوں میں اُلجھتے ہوئے دیکھ کر کہا: "لاؤ اس بچاری کا میں ہی کر دوں۔"

"چل ری، پڑ چل کے" اُس نے ویلری کا بچھونا کھول کر اُسے اُدھر ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں ری، نہیں" شیلا نے اپنے پلنگ سے پکارا: "ابھی مت لیٹیو، یہاں آ میرے پلنگ پر، آم آم کھیلیں گے۔"

ویلری روڈا کی ایک آدھ دھول تو سہہ بھی سکتی تھی، مگر شیلا کی صرف "اچھا دیکھا جائیگا" سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہلے تو وہ ذرا ٹھٹھکی، لیکن وہ ایک لمحہ کی خاموشی اُسے ایسی بھری ہوئی معلوم ہوئی کہ وہ چپ چاپ کان دبائے شیلا کی پائینتی آ بیٹھی۔ اور شیلا نے فوراً اپنی اور اُس کی مٹھیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھکر "آم والے آم دے" کہنا شروع کر دیا۔

پلنگ سے کمر لگاتے ہی نینہ اور روڈا کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُن کے آدھے دھڑ کی بالکل جان نکل گئی ہے۔ تمام دن کی مشغولیت اور شام کو اتنی دیر ٹہلتے رہنے سے اُن کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور پنڈلیاں ایسی درد کر رہی تھیں کہ انہیں کسی کل چین نہیں پڑتی تھی۔ شیلا اور ویلری کی چاپ چیں سے اُن کے ماتھے کی دھڑکتی ہوئی رگیں اور پھول آتی تھیں، مگر اب اُن میں انہیں منع کرنے اور اُن کا عندی انکار سننے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ وہ تو خاموشی سے لیٹی بھاری بھاری سانس لیکر اپنے جسم کو گرم کرنے اور سکون دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

شیلا نے اب اپنا کھیل بند کر دیا تھا، اور اُلٹی لیٹی ہوئی ویلری سے، جو اپنے پلنگ پر پڑے پڑے جمائیاں لے رہی تھی مگر شیلا کی مرضی کے خلاف سو نہ سکتی تھی، باتیں کر رہی تھی۔ نینہ کو اس کی کچھ خبر نہ تھی، وہ تو اپنے سر کی دھڑکنوں کو ایسے غور سے سُن رہی

تھی جیسے انہیں گن کر حساب بیٹھا ہو۔ ہاں روڈا جس کی کمر میں کچھ مضبوطی آ چلی تھی، کبھی کبھی گہرے سانس لیتے لیتے رُک کر اُنکی باتوں میں دلچسپی لینے لگتی تھی۔

"میں تو بس تمہارے سے بیاہ کروں گی" شیلا کہہ رہی تھی "پھر تو میں بڑی اچھی اچھی چوڑیاں پہنا کرونگی۔ بڑا مزا رہے گا۔ اور تو کس سے بیاہ کریگی، ویلری؟"

"میں؟ ہاں میں.... " ویلری نے جمائی روک کر سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں بھی کسی ایسے ہی سے کروں گی"

"تو تو پھل والے سے کریجو، ویلری" روڈا نے پتوں کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا "اپنا کھایا کیجیو خوب مزے سے کیلے"

"لو جی پھل والا!" شیلا نے اپنے طنز سے کہا جیسے روڈا اُس کی چوبداری کے انتظام میں مداخلت کر رہی ہو، اور وہ بھی اتنا نہ "پھل والے سے تو بزاز اچھا، طرح طرح کے کپڑے تو ملیں پہننے کو، جیون کرنگی بیاہ بزاز سے" وہ کہہ رہی تھی۔

"اچھا، فہیمہ سے پوچھو وہ کس سے کریگی بیاہ" روڈا چاہتی تھی کہ اب باتیں شروع ہو گئی ہیں تو کچھ دلچسپی ہی پیدا ہو۔

"تم رہنے دو بس بیاہ ویاہ کرانے کو۔ اپنا ہی کرا لو بس" فہیمہ نے ایسی بچوں کی باتوں میں شامل کئے جانے پر چڑ کر کہا، اور پھر فوراً شیلا کی طرف مڑ گئی، "شیلا! آدھی رات آ گئی اور تو ابھی تک باتیں بنائے جا رہی ہے۔ پھر سوتے کی دوپہر تک پڑی۔ اچھا ہے، صبح تیرا وار ہے، اُٹھے گی تیرا پلنگ کے ایولین"

"بڑا اُٹھا!"

"کیوں نہ اُٹھے گی؟ کوئی وہ اکیلے کریگی سارا کام؟"

"کرے چاہے نہ کرے، میں اُٹھنے دونگی اپنا پلنگ؟"

"دیکھ لیجو صبح کو کہ اُٹھا جائیگا تیرا پلنگ، کہ نہیں"

"ہاں ہاں دیکھ لوں گی!"

شیلا کو جھکولے تو پہلے ہی آ رہے تھے، لیکن اب تو اُسے یہ طے کرنا تھا کہ وہ صبح کو کس طرح "دیکھ لے گی" وہ اپنے ناخونوں سے آئیوکن کا منہ نوچ سکتی تھی، بال کھسوٹ سکتی تھی، لاتیں مار سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنے انتقامی حملے کے سارے پہلوؤں پر پہلے ہی سے غور کر لینا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ خاموش لیٹ گئی، اور آخر تفصیلات مرتب کرتے کرتے سو گئی۔

بہت دیر تک کمرے پر بالکل خاموشی طاری رہی۔ صرف کبھی کبھی ایک دو آواز سُنائی دے جاتی تھی، جس کے معنی یہ تھے کہ دوسرے کمروں میں بھی لڑکیاں سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔

آخر فلیتھ نے چونکتے ہوئے کہا "روڈا، تو لکھے گی گھر کو خط؟"

"کیوں، کیا تو لکھ رہی ہے اپنے گھر کو؟ ابھی تو ہمیں دن بھی نہ ہوئے ہونگے تجھے خط لکھے۔ مہینہ بھر سے پہلے کیسے بھیجنے دیں گی تجھے مس ساب خط؟"

"اُنہہ، اِس کا کیا ہے؟" فلیتھ اس وقت اُن دنوں کا صحیح شمار معلوم نہ کرنا چاہتی تھی "تو بھی لکھ دے گھر کو خط۔ دونوں لے کے چلیں گے مس ساب کے پاس کہ ہمیں خط بھیجے مہینہ بھر ہو گیا ہے!"

"میں نہیں لکھتی لکھاتی، تو ہی لکھ۔ لو بھلا مس ساب کو خط دکھاؤ پہلے! میں تو نہیں دکھاتی اپنا خط کسی کو!" روڈا نے اپنے اور دوسروں کو بہکانے کے لئے خط نہ لکھنے کا یہ بہانہ بنا رکھا تھا۔ ورنہ اُسے تو گھر خط لکھنے کا خیال بھی مشکل سے آتا تھا اور نہ اُس کی ماں کو ہی اُس کی خیریت معلوم کرتے رہنے کی ایسی بیتابی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اُسے اپنے آٹھ آنے کی ضرورت ہو سکتی تھی، اور وہ اُس کی ماں ہر مہینے ٹھیک وقت پر بھیج ہی دیتی تھی۔ دوسری لڑکیاں تو پیسے ملتے ہی لفافہ یا کارڈ لیتی تھیں،

مگر وہ اپنے پیسوں کے پن، سوئیاں، بُندے، ریشم کی لچھیاں اور ایسی ہی فضولیات خریدا کرتی تھی، اور پھر اُنہیں کبھی واپس نہ لینے کیلئے دوسری لڑکیوں کو اُدھار دیدیتی تھی، یا اُنہیں صابونی اور کیلے کھلا دیتی تھی۔

"ہم نہیں دکھاتے ہیں کیا اپنا خط؟" فیتھ نے اُسے پھسلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو دکھاتی ہے تو دکھا دے" روڈا نے اور آرام سے پھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم تو نہیں دکھاتے"

فیتھ کو خلافِ معمول ایک نئی شرارت سُوجھی جسے اُس نے روکنا چاہا بھی، مگر وہ رُک نہ سکی۔ اُس نے مذاق کی اناڑی اور بھدی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تو لکھتی ہوگی اپنا ایسی ویسی باتیں؟ نکالی جائے گی تو یہاں سے بھی!" روڈا یہاں دو اور شہروں کے اسکولوں سے ہوتی ہوئی آئی تھی کیونکہ وہاں کے منتظمین کی رائے میں اُسکی ماں خانگی زندگی کا کوئی درخشاں مثالی نمونہ نہ تھی۔ اور روڈا کے جراثیم سے دوسری لڑکیوں کے متاثر ہو جانے کا مہلک خطرہ تھا۔

"اجی نکال کے تو دیکھیں ذرا!" روڈا کے لئے اسکول سے خارج کر دیا جانا بھی ایسے ہی پُرلطف مذاق کی بات تھی جیسی کوئی اور۔ "چچا سے کہدوں گی!" — یہ ایک بناوٹی تنک اور پھر ایک قہقہے کے ساتھ۔

فیتھ کو خود تعجب تھا کہ وہ اندھا دھند اس رَو میں کیوں بہی چلی جا رہی ہے۔ "بڑے اچھے ہیں تیرے چچا!" اُس نے روڈا کی باتوں کو گرمانے کے لئے کہا، کیونکہ اُس کے چچا — چچاؤں — کے ذکر سے زیادہ اُس کی زبان کو رواں کر دینے والی چیز اور کوئی نہ تھی۔ درحقیقت اُس کے چچا دُنیا کی ہر نعمت کی طرح آئی جانی چیز تھے۔ شاید اُس کے نزدیک چچا کی تعریف ہی تھی: وہ چیز جو بغیر کسی توقع کے آجائے، اور

جاکر پھر کبھی نہ آئے، وہ تعجب کیا کرتی تھی کہ اُس کے باپ کا خاندان کتنا وسیع اور دُور دُور پھیلا ہوا ہے، اور وہ کبھی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکتی تھی کہ پردۂ غیب سے کوئی نیا چچا ظہور پذیر نہ ہو جائے گا۔ وہ نہ معلوم کہاں سے یکایک ٹپک پڑتے تھے، اور اُس کی ماں اُس سے اُن ہی مانوس لفظوں میں اُس کا تعارف کراتی تھی: "دیکھو روڈا! تمہارے چچا آئے ہیں!" اس کے بعد وہ پانچ چھ مہینے رہتے تھے، اپنی افتادِ مزاج کے مطابق روڈا کو پیار کرتے یا مارتے اور بات بات پر جھڑکتے تھے، اور آخر اُس کی ماں سے ایک گھر الٹ جھگڑے کے بعد دُنیا کے دوسرے کنارے کو چلے جاتے تھے۔ وہ ایسے کم سے کم چار چچاؤں کا تجربہ کر چکی تھی، اور ان میں سے آخری اور موجودہ چچا کو تو وہ کچھ عرصے تک مسٹر ہیزلڈ کے نام سے جانتی رہی تھی، مگر آخر ایک دن اُن کا صحیح شجرۂ نسب دریافت ہو گیا تھا۔

"میرے چچا کو کچھ مت کہو" روڈا نے فیتھ کو مارنے کیلئے اپنا چھوٹا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بڑے اچھے ہیں میرے چچا۔ مجھے تو گود میں بٹھا بٹھا کر پیار کرتے ہیں!"

اُس آتشیں روئے اب فیتھ کو مغلوب کر لیا تھا، اور اُس کی گردن تپ رہی تھی۔ اُس نے لحاف کھول کر اپنی ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے کہا، اور اُس کی آواز ایسی کپکپاتی ہوئی تھی جیسے وہ آنسو روک رہی ہو یا ہنسی: "تو سُنا، روڈا! اپنی ماما کی کہی بات!" روڈا نے اپنے چچاؤں کا ایک عجیب اور بے سبب میلان دریافت کیا تھا کہ وہ اُس کے سو جانے کے بعد، اور کبھی تو سوتے سوتے اٹھ کر، اُس کی ماما سے کھسر پُسر باتیں کیا کرتے تھے، اور اُس سے غیر ضروری حدوں تک قریب ہو جاتے تھے۔ جب اُس کی ماما کو یہ احساس ہو گیا کہ اب روڈا اُس کی شبانہ مشاورتوں کے لئے اجنبی نہیں رہی، بلکہ ایک خاموش سامع تک ترقی کر گئی ہے، تو اُس نے اُسکے سوتے ہونے کا یقین کر لینے کی فرسودہ رسم کو بھی اُڑا دیا تھا۔ اور روڈا کا ضمیر بھی ان کارروائیوں

کو اپنے تک محدود رکھنے کے بارے میں متردّد نہ تھا ــــــ جو چیز اسکی تھی وہ سب کی تھی، چنانچہ پیڑوں کے نیچے رات کو دیر دیر تک وہ لڑکیوں کو بھوت بنائے رکھتی تھی، مگر ایسے مجمعوں میں فیتھ کو اب تک ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کرتا تھا جیسے اُسے گندی چکنائی کے گڑھے میں ڈبویا جا رہا ہو۔

"تو نہ سُنا اپنی ماما کی کوئی بات!" روڈا نے معصومانہ چھیڑ کے ساتھ کہا، اور کچھ اس خیال سے کہ انکار فیتھ کا اشتیاق اور بھڑکا دے۔

"میری ماما کی کیا بات؟" فیتھ کے نزدیک اپنی ماما اور روڈا کی ماما کا مختصر ترین لمحے کیلئے بھی ایک سطح پر رکھا جانا دُنیا کی سب سے شرمناک اور ہتک آمیز بات تھی، جس کیلئے وہ کسی کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ "میری ماما کوئی ایسی ہیں؟" اس نے روڈا پر اپنی فوقیت ظاہر کرتے ہوئے فخریہ کہا۔

"کیسی؟" فیتھ سے لطف لینے کیلئے روڈا سنجیدہ بن رہی تھی۔

روڈا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ "ایسی" اُن چیزوں میں سے ہے جنہیں اچھی اور صاف رہنے والی لڑکیوں کو مبہم طریقے سے سمجھ لینا چاہیئے؛ ان کی تعریف کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیئے؛ اور وہ اس رمز کو سمجھانے سے سمجھ تھوڑے ہی سکتی تھی۔

اس لئے فیتھ نے اپنی آواز کو زہر میں بجھاتے ہوئے کہا: "جیسی تمہاری ماما ہیں!"

"کیسی ہیں میری ماما؟" روڈا کے لہجے میں اب بھی ناراضگی نہ تھی۔

"ہونگی کیسی ہی" فیتھ سے اب انتظار نہ ہو رہا تھا۔ "تو سُنا کوئی بات۔ پھر دیر ہوتی جارہی ہے۔"

"اچھا تو سُنا پہلے اسے دیکھ لے: پھر میں سُناؤں گی تجھے ایسی مزیدار بات کہ تو نے کبھی بھی نہ سُنی ہوگی۔"

وہ فیتھ کو زیادہ تنگ نہ کرنا چاہتی تھی، اور اس کے مسلسل خوشامدانہ اصرار سے

نرم پڑ چلی تھی۔ وہ کوئی چٹ پٹا واقعہ یاد ہی کر رہی تھی کہ سائبان کے فرش پر ہیولا کے جوتے کی کیلیں بجیں۔ "لے وہ آرہی ہے تیری نانی! اُس سے سُنیو۔" روڈا نے ایک نئے لطف کی اُمید پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"واہ ری وا!" فلیتھ نے اُس کی سنگدل بے پروائی پر افسوس کے ساتھ کہا۔ "تو نے یوں ہی وقت خراب کیا، اور ضدیں لگاتی رہی!"

ہیولا، جس نے داخل ہونے سے پہلے احتیاط کے ساتھ اپنی گردن اور ٹانگیں اکڑا لی تھیں، فلیتھ کے پلنگ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اُسے دیکھتے ہی روڈا نے چیخ کر کہا، "بتاؤ جی تم اتنی دیر میں کیوں آئی ہو؟ کیا کر رہی تھیں تم اب تک مارگریٹا کے پاس؟"

"تُو کون ہے پوچھنے والی؟ بڑی آئی ہے بن کے میری وہ!" ہیولا روڈا پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت غصّے میں ہے اور اگلے ہی لفظ پر مُنہ نوچ لے گی، تاکہ روڈا آگے نہ بڑھ سکے اور وہیں رُک جائے۔ مگر اُسی لمحے اُس کی نظریں اپنے پلنگ پر پڑیں، اور وہ حقیقی غصّے سے تن تنا اُٹھی، "یہ میرا پلنگ کس نے ہٹایا ہے پیچھے؟"

فلیتھ اور روڈا نے یہی طے کیا کہ چُپ رہنے سے زیادہ رُعب پڑتا ہے۔

"میں نہیں جانتی ہوں؟ کس نے ہٹایا ہے میرا پلنگ؟" ہیولا نے دُہرایا، اور پھر فلیتھ کے پلنگ کو دروازے کے قریب دیکھ کر، "یہ تو ہو گی فلیتھ؟"

اب فلیتھ کو بولے بغیر چارہ نہیں تھا، مگر پھر بھی اُس نے صلح جوئی کی کوشش میں کوئی خرابی نہ دیکھی، "ذرا سا پیچھے کو کر دیا ہے، تیرا کیا حرج ہے؟ میرا جی گھبرا رہا تھا اندھیرے میں، میں نے دروازے کے قریب کو کر لیا اپنا پلنگ۔"

"جی گھبرا رہا تھا تو میں کیا کروں؟"

"کرو کیا، لیٹ جاؤ"۔ روڈا نے صلاح دی۔

"میں تجھ سے نہیں بول رہی ہوں ری گدھی!" ہیولا غضب ناک ہو کر چلائی۔

روڈا نے اُٹھ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا: "نہیں بولتی میلی چھوتی چھی بلّو؟.... لو مت، ہم جلدی چھے بُلوا لیں گے"۔ اور اُس نے ہیولا کی کمر کو پیار سے تھپ تھپانا شروع کر دیا۔

ہیولا تلملائی تو بہت، مگر روڈا کی گرفت میں اُس کے دُبلے پتلے بازوؤں کی کچھ پیش نہ گئی۔ وہ چیختی چلاتی ہی رہی: "میں کاٹ کھاؤں گی.... سچ کہہ رہی ہوں میں کاٹ کھاؤں گی!" اور روڈا نے اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور بچوں کی طرح کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔

رات کے سناٹے میں ہیولا کی چیخیں اور روڈا کے قہقہے میٹرن کے کمرے تک جا پہنچے تھے، اور وہ اپنی بوڑھی ٹانگوں پر سنبھلتی سنبھلاتی، دُور سے پکارتی آ رہی تھی: "ہم کہہ رہے ہیں، یہ کیا شور و غل مچا رکھا ہے راتوں کو؟"

اندھیرے میں میٹرن کی کمزور آنکھیں ابھی تک کچھ دیکھ نہ سکی تھیں۔ اور وہ کمرے کی چھت سے ڈانٹ کر پوچھ رہی تھی: "کیا دُند ہے یہ؟"

"یہ ہیں فلیتھ اور روڈا!" ہیولا نے روڈا کی گود سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"میں کیسے ہوں، میں کیسے ہوں؟" فلیتھ نے اپنے آپ کو پھنستے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"اِس نے میرا پلنگ پیچھے ہٹا کے اپنا بچھا لیا ہے!" ہیولا نے شکایت کی، اور پھر میٹرن کے اپنی طرف ہونے کے یقین کے ساتھ حکم دیا: "ہٹاؤ یہاں سے پلنگ!"

اب تو فلیتھ کو بھی ضد چڑھ گئی تھی: "میں تو نہیں ہٹاؤں گی!"

"کیسے نہیں ہٹائے گی!"

اور دونوں نے اپنا اپنا جنگی نعرہ اتنی زور زور سے اور اتنی مرتبہ دُہرایا کہ آخر میٹرن کو اُن کے بیچ میں آکر اپنے ہاتھوں سے اُنہیں الگ کرنا پڑا۔ دوسرے کمروں میں بھی اکثر لڑکیاں جاگ اُٹھیں، مگر جب اُنہیں معلوم ہوا کہ دو لڑکیوں میں لڑائی سے زیادہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہو تو اُنہوں نے صبح سویرے اُٹھنے پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اور کچی نیند میں جگا دینے والیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے پھر تکیہ میں مُنہ دے لیا۔

"چلو، چل کے پڑو اپنے اپنے پلنگوں پر!" میٹرن دونوں کو ڈھکیل ڈھکیل کر کہہ رہی تھی وہ کسی طرف کا بھی الزام نہ لینا چاہتی تھی، کیونکہ اُسے نیند آ رہی تھی، اور تیس سال تک بیچ بچاؤ کرتے کرتے وہ جان گئی تھی کہ لڑکیوں کے جھگڑے کسی اور طرح طے ہو ہی نہیں سکتے۔ ہیولا نے اُس سے انصاف کرنے کے ہزار مطالبے کئے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، اور یہی کہتی رہی، "چلو لیٹو، ہم کہہ رہے ہیں۔ مورننگ میں ہم تمہیں مس ساب کے سامنے کر دینگے پیش، اُن سے کرا لینا اپنا ججمینٹ!"

"روڈا کو بھی کچھ نہیں کہتی ہو تم؟ یہ مار رہی تھی مجھے!" ہیولا نے سوچا کہ فیصلہ سے تو خیر رہ ہی گئی، مگر روڈا کو تو بلوہ مچا کر نہ نکلنے دے۔

یہ تجویز میٹرن کو بھی ناپسند نہ تھی، کیونکہ اُس کی رعایا میں سب سے سرکش روڈا ہی تھی۔ "روڈا، ہم کہہ رہئے ہیں یہ کیا بات ہو؟!"

"یہ وہی بات ہے جو تم کہہ رہی ہو!" روڈا نے دھپ سے پلنگ پر گر کر ہوا میں ٹانگ نچاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیرو تم۔ ہم بولیں گے مس ساب سے کہ یہ زبان دیتی ہے ہمیں!" میٹرن چاہتی تھی کہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہ کر اپنی دھمکی کی سنجیدگی میں وزن بڑھا دے۔

"جاؤ جاؤ، جا کے اپنی لنگڑی چماری کو پڑھاؤ!" ایکے روڈا نے لحاف میں ٹانگ اڑا کر ایسی زور سے کھینچا جیسے میٹرن کی تانت بنا رہی ہو۔

"یہ چماری کی بات کیوں بولتی ہو تم بار بار، ہم کہہ رہے ہیں؟ ہم یہ کبھی بولیں گے مس ساب سے۔"

"اچھا بول دینا، ہم بھی بولیں گے تمہاری ایک بات مس ساب سے، ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔"

"ہماری کیا بات؟ کیا بولو گی تم؟" میٹرن چوکنی ہو گئی تھی۔

"ہو گی کچھ! ہم اُن ہی سے کہہ دینگے بس!"

اس "ایک بات" کے ابہام نے جو کچن سے آلو چرا کر چماری کے ہاتھ بکوا لینے سے لے کر خدا جانے کہاں تک پہونچ سکتی تھی، میٹرن کو لرزا دیا، اور اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ روڈا سے لڑائی مول نہ لے، اور یہاں سے کھسک جائے۔ اور وہ "چلو چلو سوؤ" کہتی ہوئی، لڑکھڑاتی ڈگمگاتی چل دی۔

میٹرن کے چلے جانے کے بعد نبیتھ نے ہیولا کو جلانے کے لئے قہقہہ لگا کر روڈا سے کہا: "تو نے خوب بھگایا بڑھیا کو! وہ کیا بات ہے جو تو کہہ رہی تھی مس ساب سے کہہ دوں گی؟"

"ارے وہ؟ وہ بات یہ ہے کہ ایک لڑکا گزرتا ہے ادھر سے روز ہاتھ میں سائیکل لئے ہوئے۔ ایک دن آپ پیڑوں میں چھپی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اُس سے۔ میں نے دیکھ لیا۔ میں تاک میں رہی کہ دیکھوں یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ چلنے لگا تو جیب میں سے نکال کے اُس نے ایک ہرا رومال دیا ریشمی۔ آپ نے اُسے رکھ لیا اپنے کپڑوں میں چھپا کے۔ میں دیکھتی رہی کہ یہ کریگی کیا اس کا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو آپ نے بلایا کورنش ٹھینس کو اپنے پاس کسی بہانے سے، اور چپکے سے ہاتھ میں دے دیا وہ رومال۔ اور وہ اُسے لیتے ہی اپنے کمرے کو چل دی... یہ تھی وہ بات! جو اس نے شکایت کی مس ساب سے تو میں کہہ دونگی صاف صاف۔" اور واقعی روڈا پکا ارادہ کر چکی تھی، کیونکہ سب لڑکیاں

جانتی تھیں کہ دسوں احکام میں سے ساتویں کو مس صاحب سب سے زیادہ مقدّس اور نا قابلِ ترمیم سمجھتی تھیں۔

"اچھا ہے، کہہ دیجیو" فیتھ نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا، "جبھی ٹھیک ہوگی یہ!"

"کیوں ری ہیولا کہہ دوں یہ بات؟" روڈا نے اُسے منانے کے خیال سے اُسکی رائے پوچھی۔ مگر اُس نے تو اپنے آپ کو سر سے پیر تک لحاف میں لپیٹ رکھا تھا۔

"جانے بھی دے، کس سے بول رئی ہے!" فیتھ نے اپنی زبان پر ایک ہلکا سا تیزابی مزا محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بجا ہوگا اب؟" روڈا نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"دس تو بج گئے ہوں گے ضرور"

"تو سونا چاہیئے اب تو؟"

"ہاں، اور کیا! بہت دیر ہوگئی ہے۔ چلو سوؤ اب"

روڈا اتنی جلدی خُر خُر کرنے لگی جیسے وہ صرف فیتھ کی اجازت ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور ہیولا تو ایسی پڑی تھی جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہ تھی۔

مگر فیتھ کو کسی طرح نیند نہ آرہی تھی، حالانکہ وہ پہلے سے شکستگی محسوس کر رہی تھی، اور اپنی پانی سے بھری ہوئی آنکھوں کو ملتے ملتے اُس نے اپنے سر کو اتنا ہلا ڈالا تھا کہ اُس کی رگیں اینٹھنے لگی تھیں، مگر نہ جانے اُس کی نیند کو کیا ہوگیا تھا۔ اُس کا تکیہ اتنا چھوٹا اور پتلا تھا کہ وہ اُس پر اچھی طرح اپنا سر بھی نہ رگڑ سکتی تھی، اور ایسا سخت پتھر کہ اُس کے کان توڑے دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ چت لیٹنے پر مجبور تھی، ورنہ وہ تو چاہتی تھی کہ کروٹیں بدل بدل کر اپنے بدن کو ایسا چور کر دے کہ اُسے نیند آجائے۔ کمرے کی سیلن نے لحاف میں ایسی نمی اور بُو پیدا کر دی تھی کہ مُنہ پر نہ ڈالا جاتا تھا، حالانکہ کھلے ہوئے دروازے میں سے برفیلی ہوا سیدھی آکر اُس کی ناک پر لگ رہی تھی، اور اُسکے حلق میں زکام کی خراش

شروع ہو گئی تھی۔ اور ویسے بھی وہ لحاف کون سا بڑا سردی سے بچا رہا تھا، اُسکی پرانی روئی ٹوٹ ٹوٹ کر اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی، اور اُس میں اتنے اتنے بڑے بھنباتے کھل گئے تھے جن میں سے ہو کر ہوا کے تیز جھونکے فلیتھ کے جسم میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ سردی ایسی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی کہ آخر فلیتھ کو اُٹھ کر چادر اور کوٹ لحاف کے اوپر ڈالنا پڑا۔ مگر جاڑا ان ہلکے پھلکے اضافوں کے مان کا نہ تھا؛ فلیتھ کے پیر اب بھی ایسے ہی جمے جا رہے تھے جیسے پہلے۔ کمروں پر، کھیل کے میدان پر، سڑک پر، شہر پر، ساری کائنات پر موت کا سا لرزہ خیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے قہقہے جن سے شام میدان گونج رہا تھا نہ معلوم اب کہاں جا سوئے تھے؛ یہانتک کہ اس وقت روڈا کی خر خر بھی بند تھی۔ سڑک پر کوئی بھولا بسرا تانگہ تک نہ گزر رہا تھا۔ اس جہاں پوش تنہائی اور خاموشی میں اگر کوئی آواز تھی تو وہ اندھیرے کی گونگی بارش کی۔ ہاں، کہیں دُور ایک انجن ہلکے ہلکے سانس لے رہا تھا جسکی آواز تاریکی اور تنہائی کے ظلمات میں اجنبی اور کینہ توز ہستیوں کے وجود کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ فلیتھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہیولا، روڈا، ویلیری، شیلا، ساری لڑکیاں، دیواریں، عمارتیں، پیڑ، سب دھواں بن کر غائب ہو گئے ہیں، اور وہ ایک بے جان احساس کُش خلا میں اکیلی لٹکی رہ گئی ہے، اُسے یاد بھی آیا کہ اسکول کے قاعدے اور ماما کی تاکید کے مطابق اُسے سونے سے پہلے دُعا کرنا چاہیے، مگر اس کا ہر ہر جوڑ ایسا کسل مند اور بوجھل ہو رہا تھا کہ اُس میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اور پھر اس گھلا دینے والی تنہائی میں کہ جب زمین اُسکے نیچے سے نکل کر غائب ہو گئی تھی، ہر چیز بے اثر اور بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ شاید یہ اندھی تنہائی ایک سیاہ کپڑا تھا جو کائنات کے، زندگی کے مُنہ میں حلق تک ٹھونس دیا گیا تھا۔ فلیتھ کا صرف جسم ہی تھکا ہوا نہ تھا، بلکہ اس کی رُوح بھی منوں بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ اُس نے شام سے لیکر اب تک سارا وقت، الجھیڑوں، ہنگاموں، جھگڑوں کے درمیان، بے سبب خوفوں، مبہم اضطرابوں، بے نام کیفیتوں، اور ملگجی مگر رسیلی خواہشوں کے درمیان بچد

مصروفیت کے ساتھ گزارا تھا، اور یہ سب اُسکی رُوح کیلئے ایک بدمزہ گرانی چھوڑ گئے تھے۔ اُس نے اپنی رُوح کو بے اندازہ دوڑایا تھا؛ وہ دوڑتے دوڑتے شل ہو چکی تھی، اور اب جماہیاں لے لے کر اپنے آپ کو بے حس کر لینا چاہتی تھی۔ اور اُسے دوڑانے سے آخر فائدہ ہی کیا ہوا تھا؟ وہ مچھر بھرے کنّے کی طرح چھلّانی ہوتی اور مُردہ بن گئی تھی۔ اگر کہیں روڈا اپنی ماما کی بات سُنا دیتی تو فیتھ کی رُوح کا کسیلا پن اور کبھی دوچند ہو جاتا، اور اُسکی رانوں کی نسیں کھنچ کھنچ کر ٹوٹنے لگتیں۔ جو کچھ وہ کرتی رہتی تھی اُس سے آخر کیا فائدہ ہوا تھا؟ جو کچھ بھی وہ کرتی اُس سے آخر کیا فائدہ ہوتا؟ کچھ کرنے ہی سے آخر کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اب مثلاً وہ بیولا سے پلنگ بچھانے پر اتنا لڑی جھگڑی تھی۔ کھمبے کی روشنی کے سامنے پلنگ بچھا کر اُسے کیا مل گیا؟ اُسے دو جہاں کا عیش حاصل ہو گیا، یا اُسے کوئی ساتھی مل گیا، یا اُسکی تنہائی کچھ کم ہو گئی، یا اندھیرے کی وحشت ہلکی پڑ گئی؟ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا! ہو ہی کیا سکتا تھا؟ سب ویسے ہی تھا جیسے کہ پہلے تھا، جیسے کہ رہتا۔ کھمبے کی گاڑھی گاڑھی زرد روشنی زمین کے تھوڑے سے ٹکڑے پر پڑی ہوئی تھی، اور بس۔ اسکے بعد اندھیرا ہی اندھیرا! اندھیرے کے بھنور نے فیتھ کے حواس مختل کر دیے تھے اور اُس کا سر چکرانے لگا تھا؛ کبھی تو اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرّے کے دوسری طرف پہونچ گئی ہے اور اُسکی عقل حیران ہے کہ اُسے یہاں کون لایا؛ اور کبھی اندھیرا اُسے پھر کھمبے کی روشنی کے سامنے لا پٹختا تھا۔ فیتھ کے پلنگ پر، سب گھروں پر، گھاس کے میدان اور پیڑوں کے جھنڈ پر، پارسنگار کی جھاڑیوں پر، سڑک اور اُس کے پار ریلوے لائن پر، اس شہر سے لیکر فیتھ کے گھر تک سارے گاؤں اور قصبوں پر، اُسکے گھر کے آنگن اور چھوٹے چھوٹے طاقوں پر، اُن بڑے سے بڑے فاصلوں پر جن کا وہ تصوّر کر سکتی تھی، افریقہ کے اس سرے سے اُس سرے تک، ہر جگہ، ہر طرف اندھیرے کی قہّار لا انتہائیاں دراز تھیں۔ اندھیرے کی طغیانی نے ہر چیز کو نگل لیا تھا؛ ہر چیز نے اپنی شناخت اور شخصیت اُسکے حوالے کر دی تھی، اور گھل کر ایک بے شکل، سیاہ پہنائی میں مل گئی تھی۔ اندھیرا اُوپر

ہمیشہ سے زیادہ دُور ہٹے ہوئے دھندلے ستاروں تک، اور نیچے گہری سے گہری تحت الثریٰ تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے بیچ میں فلیتہ یکہ و تنہا معلّق تھی۔ شاید فلیتہ اندھیرے پر اُٹھتی اُٹھتی ستاروں کے درمیان جا پہنچے، اور اُن سے اُوپر اندھیرے کو بخوف و ہراس تکتی ہوئی، آسمانی سکون کے ساتھ، آہستہ آہستہ، ہلکے ہلکے، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک، اور دوسرے سے تیسرے تک ہمیشہ سفر کرتی رہے! شاید وہ اندھیرے کے ساتھ ساتھ نیچے بے ہوش گہرائیوں میں گم ہونے لگے، اور اس کا گرنا کبھی ختم نہ ہو۔ یا شاید وہ اسی طرح بیچ میں لٹکے ہی لٹکے ہمیشگیاں گزار دے۔ یہ سب اندھیرے پر منحصر تھا.... آخر وہ کہاں جائے گی؟ اُوپر یا نیچے؟ یا بیچ ہی میں رہے گی؟ کدھر؟ —— کہاں؟

۲۰ر جولائی سنہ ۴۲ء

ایک معمولی خط

آپ کے اور میرے لئے تو یہ صرف ایک بے ضرر، بلکہ مزیدار، حماقت ہوتی جس پر اکیلے میں کیا دوسروں کو بھی سُنا کر ہنسا جا سکتا ہے، مگر اُس کا ذکر کرتے ہوئے اِسے اُن اضطراری کمزوریوں میں شمار کرنا پڑے گا جن کی یاد ہمیشہ آنکھوں کے نیچے پسینہ لے آتی ہے، کیونکہ اُس کی زندگی میں کمزوریوں کی تعداد اتنی معمولی تھی کہ وزن اور سنجیدگی کے لحاظ سے اُن کو مختلف درجوں میں ترتیب نہ دیا جا سکتا تھا۔ کمزوریوں کو چھوڑئیے، زور آوری ہی کون سی تھی۔ اُس کی زندگی ہر قسم کے غیر معمولی اور بعید از راہ واقعات سے ایسی ہی خالی تھی جیسے ——— اُس کے حسبِ حال میں کوئی تشبیہہ تک نہیں سوچ سکتا۔ ممکن ہے کہ تشبیہہ برائے تشبیہہ کی غرض سے میں بجلی کے کھمبے کا نام لے دوں، مگر پھر مجھے خیال آتا ہے کہ شریر بچے اُسے اینٹ سے بجاتے ہوئے چلتے ہیں، صبح شام ایک فاختہ اُس پر بیٹھ کر کو کو کرتی ہے، کبھی کبھی گاڑیاں اُس سے ٹکرا جاتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ اُسکی زندگی بالکل ایک شریف آدمی کے کپڑوں کی طرح تھی جن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ آپ اُنہیں یاد نہیں رکھ سکتے۔ وہ اُس مسکین اور مطمئن اقلیت کا ایک فرد تھا جو اگر کبھی اچھے نمبر نہیں حاصل کرتی تو کبھی فیل بھی نہیں ہوتی، جو ایسی ویسی باتوں میں بالکل نہیں پڑتی، اور جس سے ہمیشہ نہایت خوش اخلاقی اور تہذیب سے پیش آیا جاتا ہے

مگر ربط و ضبط بڑھانے کی کبھی خواہش نہیں کی جاتی۔ اپنے اُستادوں کی نظر میں وہ ایسا تھا۔ ذہین مگر خاموش، محنتی اور سیدھا سادا طالبِ علم تھا جس کا ہر فعل اتنا قابلِ اعتماد اور نپا تُلا ہوتا ہے کہ اُس کے وجود کو ذہن میں رکھنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُس کے ساتھیوں کے نزدیک اُس کی متانت اتنی بوجھل اور ٹھس تھی کہ وہ اُسے ایک بناوٹی مُسکراہٹ سے زیادہ کچھ نہ دے سکتے تھے؛ اور محلّے کے والدین کے لیے وہ اولاد کی نیک سیرتی اور خوش کرداری کا ایک مثالی نمونہ تھا۔ کسی کے خوابوں میں اُترنے کی کوشش کرنا تو فانی انسان کے لیے ایک خطرناک مُہم ہے، مگر جہاں تک وثوق سے کہا جا سکتا ہے اُس کے دن کتابوں، امتحانوں اور چھٹیوں کے درمیان نہایت آسانی سے گزر رہے تھے؛ اور اپنے طرزِ زندگی میں عیب نکالنے کی کوئی وجہ اُسے اب تک نہ ملی تھی۔

لیکن اُس کی آزمائش کا لمحہ اُس وقت آیا جب وہ بی۔ اے کا امتحان دیکر گھر آگیا۔ پہلے تو اُس کی چھٹیاں اگلی کلاس کے لیے تیاری کرنے میں کٹ جایا کرتی تھیں، مگر اس مرتبہ اُسے اپنے وقت کا ایسا کوئی مصرف نظر نہ آرہا تھا۔ اب تک اُس کی زندگی ایک نہایت صحیح پیمانے سے کھنچی ہوئی گہری اور واضح لکیروں کے درمیان بٹی رہی تھی؛ اپنے سفر میں وہ اب ایک ایسے نقطے پر آ پہونچا تھا جس کے آگے کوئی لکیر نہ تھی۔ وہ رسم و رواج کے مقرر کیے ہوئے راستے پر سر جھکائے ہوئے چلتا رہا تھا مگر ذہنیت کے ریگستان میں پہونچ کر وہ پگڈنڈی خود گم ہو جاتی تھی۔ شروع میں اس نے چاہا کہ اپنے کورس کو ہی دوبارہ پڑھے، مگر امتحان کی چاشنی کے بغیر وہ اتنا پھیکا پھُس پھُسا ہو گیا تھا کہ اُس سے چل نہ سکا۔ اُس نے ایک کے بعد دوسری چیزوں میں دلچسپی لینے کی متعدد کوششیں کیں، مگر شاید مسرت دن اور رات کی سرحدوں کے باہر پرواز کر گئی تھی۔ ہر چیز پر سے ملمّع اُتر گیا تھا؛ ہر چیز بھونڈا اور بے رنگ ہو گئی تھی اور

اُس کے لئے اب اِس کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اُکتاہٹ اور بیزاری کے سمندر میں بے دست و پا غوطے لگایا کرے۔ عموماً لوگوں کو پیچھے چھوڑے ہوئے دنوں کی یاد عرصے تک بے چین رکھتی ہے، مگر یقین مانیئے کہ اُس کا ایک دن خود اُس کی نظروں میں دوسرے دن سے اتنا بے امتیاز تھا کہ وہ سب بجھتے ہوئے کوئلوں کی طرح راکھ ہوتے جا رہے تھے۔

نہ معلوم اُس کے کتنے دن اور اسی طرح جماہیاں لیتے ہوئے گزرتے، مگر ایک دن بازار سے لوٹتے ہوئے اُس نے جو کچھ دیکھا اُس نے خوشی نہ سہی، اُس کے ویران دنوں اور راتوں کے لئے کم سے کم ایک رنج تو مہیا کر دیا۔ وہ اتنا معصوم نہ تھا کہ اُس کے لئے ایک لڑکی کا کھڑکی سے جھانک کر گلی میں کھڑے ہوئے لڑکے کی طرف مُسکرا دینا عجوبۂ روزگار ہوتا۔ مگر اس معمولی سے واقعے کی نُدرت اُس کے اندر یہ تلخ اور ہمّت شکن احساس پیدا کر دینے میں تھی کہ اُس نے برساتی دنوں کے لئے کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ اپنے پڑھے ہوئے معدودے چند عشقیہ افسانوں کو اُس نے ہمیشہ کاغذی باتیں اور زندگی سے بے تعلق سمجھا تھا، اور اس حقیقت سے غافل رہا تھا کہ رومان مکڑی کے جالے سہی، مگر ہماری زندگی کی رگوں سے یک جان ہو کر وہ انہیں کتنا مضبوط بنا دیتے ہیں، اور عشق پیچہ کی یہ ننھی ننھی بیلیں کیسے کیسے گرتے ہوئے ستونوں کو تھامے رہتی ہیں۔ طالب علمی ہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب زیادہ خطرہ مول لئے بغیر زندگی بھر کے سہارے کے لئے دو چار نگاہوں، ایک آدھ مسکراہٹوں کا اندوختہ جمع کیا جا سکتا ہے، مگر اُس کے نادان ہاتھوں نے موقع کا زرّیں دامن انتہائی بے پروائی سے پھسل جانے دیا تھا۔ لفظوں کے معنی لکھ لینے کی بیتابی میں اُس نے اپنی آنکھوں کو کتاب پر گاڑے رکھا تھا، حالانکہ وہ اُن سے بہتر کام بھی لے سکتا تھا۔ جو کچھ اُس نے اندھا بن کر کھو دیا تھا اب اُسے دوبارہ پا لینا محال تھا۔ اپنی پیش قدمی کا جواب پا سکنے

کی توقع تو کُجا اُس کی سمجھ میں کوئی ایسی لڑکی بھی نہ آئی تھی جس کی طرف وہ پہلی قدمی کرسکے۔ کالج کی چھ لڑکیوں میں سے ایک نہ ایک تو ضرور اُس کی طرف توجہ کرتی ہی۔ اُسے کسی اونچی اُڑان کی خواہش نہ تھی۔ ہر لڑکی کے امکانات پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ اور کوئی نہیں تو اُس کی ساتھی اینجلا کو حُسن ضرور کچھ نرم پڑجاتی۔ لڑکے اُس کی سیاہ رنگت، بھاری بدن اور ڈھلی ہوئی عمر کا مذاق اُڑاتے تھے، مگر اُس کی آنکھیں تو چمکدار، اُداس اور گہری گہری سی تھیں، اور یہ بہت کافی تھا۔ اور پھر وہ سب لڑکیوں سے زیادہ سلیم الطبع اور خاموش تھی۔ کاش کہ اُس نے یہ سب پہلے سوچا ہوتا! اُسے اینجلا کے ردّعمل کا اتنا یقین تھا کہ اِس پر ایک دو دِن تک غور کرتے کرتے اُس کی شکستگی، مایوسی اور جھنجلاہٹ اس حد تک بڑھ گئی جیسے ملاقات کا وقت تک مقرر ہو چکا ہو، مگر وہ پہونچ نہ سکا ہو۔ وہ واقعی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا جیسے اُس نے اینجلا سے وعدہ خلافی کی ہو اور اُسے دھوکا دیا ہو۔ اُس کا رنج اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اب اُسکے ملنے کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔

لیکن اُسے یہ جان کر بڑا خوشگوار تعجب ہوا کہ حالات اتنے مایوس کُن نہیں تھے، جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ ابھی سہارے کے لئے ایک تنکا باقی تھا، یعنی وہ اینجلا کو خط لکھ سکتا تھا۔ کلاس کی دونوں لڑکیوں کے پتے مسرّت بخش معلومات کے طور پر لڑکے اکثر دُہرایا کرتے تھے، اور وہ تقریباً سبھی کو یاد ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اُسے بھی۔ چُنانچہ اینجلا کو خط لکھ دینا کوئی بڑا مشکل مرحلہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں تھیں جو آنکھوں کے پیغامات میں نہ سما سکتی تھیں مگر اُنہیں خط میں لکھا جا سکتا تھا۔ شاید اُس کی اناڑی آنکھیں اُس کے دل کی لگن کو ذرا بھی ظاہر نہ کرسکتیں، شاید وہ جرأت نہ کرسکتا۔ مگر خط کو وہ زیادہ سے زیادہ مؤثر بنا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اُس کی نگاہوں کی بیتابی دیکھ کر ہنس دیتی اور اینجلا کا استہزا نشتر کی طرح اُس کی روح میں

اُتر جاتا۔ لیکن اگر خط پڑھ کر وہ ہنسی بھی تو اُسے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نہ سمجھئے کہ اُس نے صرف روشن پہلوؤں پر ہی نظر ڈالی۔ اُس کے سامنے ناامیدی اور مایوسی بھی آئی، وہ اینجلا کی برہمی کے خیال سے بھی کانپا، اُس کے تصور نے اُسے ہولناک نتائج بھی دکھائے، اور اُس کے حق میں یہ کہنا پڑے گا کہ اُسے یہ بھی شبہ ہوا کہ وہ اُسے پہچان نہ سکے گی۔ وہ کبھی جلسے میں شریک نہ ہوا تھا۔ اتنی بڑی کلاس میں سب سے آخر میں بیٹھتا تھا، اور مضمون سنانا تو درکنار اُسے کسی سوال کا جواب دینے کے لئے بھی اُٹھنا نہ پڑا تھا۔ غرضکہ اینجلا کے اُس سے واقف ہونے کی کوئی بھی شہادت نہ ملتی تھی۔ لیکن جس چیز نے اُسے آخری فیصلہ کرنے میں مدد دی وہ اُس کی پتلی ناک تھی جس کی تعریف اُس نے بچپن میں اپنی ماں کی ملنے والیوں سے سنی تھی، اور جسے اسکے خیال میں کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا ۔۔۔ اینجلا بھی نہیں۔ بلکہ اُسے چند ایسے موقعے یاد آتے معلوم ہو رہے تھے کہ جب اینجلا نے اُس کی طرف غور سے دیکھا تھا۔

اُس نے وہ مختصر سا خط لکھنے میں دو دن لگا دیے۔ پہلے تو اُس کا ارادہ تھا کہ ایک محبت نامہ لکھے۔ لیکن وہ اس فن میں اتنا مبتدی تھا کہ اُسے اپنا سارا سوچا ہوا مضمون اُکھڑا اُکھڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے اُس کا ذہن اس قسم کے خط کو سنگین ترین جرائم سے کسی طرح متعلق سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے خط کو حتی الامکان پاکیزہ بنانے کی کوشش کی، حالانکہ یہ خط بھی، جیسا کہ آپ اس سے توقع کر سکتے ہیں، اُتنا ہی اُن گھڑ اور ناقابلِ یقین تھا۔ خط در اصل میں اُس نے اس جرأت کی معافی مانگی تھی، اور آخر تک اِسے اتنی مرتبہ دُہرایا تھا کہ اُس کی انکساری مشکوک معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ لوگ اپنی اپنی پسند سے دور دور ملکوں میں خطوں کے ذریعے سے دوست بناتے ہیں۔ اُس نے بھی اسی نسخے کو استعمال کیا۔ حالانکہ اس کا ضلع اینجلا کے ضلع سے ایسا دور نہ تھا، مگر اُس نے لکھا کہ اُسے اُس حصۂ زمین سے بہت دلچسپی ہے، اور وہ وہاں

کوئی دوست بنانا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اُس کی ساتھی ہے، اس لئے اُس کو ایسی دوستی میں زیادہ آسانی نظر آتی ہے۔ یہ دو دن اُس نے انتہائی ہیجان کے ساتھ گزارے تھے، اور اپنے ارادے اور خط کے مضمون کو بیسیوں مرتبہ دہرا لئے تھے۔ خط ڈال لینے جاتے ہوئے بھی اُس کا دماغ اتفاقاً پھاڑ پھینکنے اور آہستہ ڈال دینے کے درمیان بٹا ہوا تھا۔ وہ کتنا چوروں کی طرح اِدھر اُدھر تاکتا، اور لفافے کو بڑھاتا رہا، لیکن بکس کے پاس اُسکے اندر ایک بیوقوفانہ تیزی سے اُٹھی، اور وہ لفافے کو لیٹر بکس میں ٹھونس کر ایسے چلا جیسے واقعی چوری کر کے بھاگ رہا ہو۔ مگر اس عمل کے ساتھ ہی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے اندر کوئی بجلی کا بٹن بند کر دیا گیا ہو۔ اُس کا سارا ہیجان اور اشتعال یکلخت غائب ہو گیا، اور وہ گھر تک آتے آتے اپنی اس وقتی حماقت پر ہنس پڑا۔ اُس کے سر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا تھا، اور وہ اب زیادہ آزادی سے سانس لے رہا تھا۔ یہ سارا واقعہ ایسا ہی تھا جیسا وہ سمجھتا رہا تھا کہ ایک آدھ دن ہی میں وہ اسے بھول جائے گا۔ جواب کی تو اُسے پہلے بھی زیادہ اُمید نہ تھی، مگر اپنا توازن پا لینے کے بعد وہ اِس سے بالکل بے پروا ہو گیا۔ ممکن ہے کہ یہ اس سب کو بھول جانے کی غیر شعوری کوشش ہو، مگر اب اُسے بہت سی دلچسپیاں مل گئی تھیں۔ وہ گھر کا سودا خود لانے لگا تھا، سب کے بستر بھی اپنے آپ بچھاتا تھا، اور محلے والوں سے بھی زیادہ ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔

ابھی کالجوں کی چھٹیاں ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے شہر میں ملازمت مل گئی۔ اُس کے باپ کے ایک دوست نے اُسے جگہ دلوانے کا وعدہ کر لیا تھا، اور وہ ملتی ہوئی آدھی کو چھوڑ کر پوری کے پیچھے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں نہ تھا۔ اور یوں بھی پچاس سے تنخواہ شروع تھی، چار روپے سالانہ ترقی، اور پھر موقع آنے پر ہیڈ کلرکی مل جانے کا وعدہ۔ اُس کو ایک تسلی یہ بھی تھی کہ وہ صرف تیسرے درجے ہی میں تو پاس ہوا تھا۔ ملازمت کے چھ مہینے بعد ہی اُس کی شادی بھی

ہو گئی۔ ہری ہری گھاس دیکھ کر گدھا زیادہ سے زیادہ کان ہلانے لگتا ہے۔ نوکری اور بیوی پا کر شاید اُس نے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ مگر بہرحال اب وہ ریگستان سے نکل کر پھر مقررہ راستوں کے درمیان پہونچ گیا تھا جن پر وہ سر جھکائے چل سکتا تھا، اب اُس کی زندگی پھر گہری اور واضح لکیروں کے درمیان بانٹ دی گئی تھی۔ اُسکے سامنے مستقبل میں ہیڈ کلرکی کے وعدے کا روشن مینار رہتا جس سے چُندھیا کر اُسکی آنکھیں آگے دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اُس کا ماضی وہ اندھا کنواں بن چکا تھا جس میں جھانکنے کی اُسے کوئی خواہش نہ تھی اور ہوتی بھی تو وہاں مشکل ہی سے کچھ نظر آتا۔ حال کی بھول بھلیاں میں بغیر کسی احساس کے گھومتے رہنا — بس یہ تھی اُسکی زندگی!

حال کی بھول بھلیاں بھی بڑی پُرفریب چیز ہے! آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اُسی جگہ گھوم رہے ہیں، مگر وہ خود سرکتی رہتی ہے، اور آپ کو کہیں سے کہیں لا کر چھوڑتی ہے۔ اُسے اس عمل کا پتہ اُس وقت چلا تھا جب وہ پانچ سال آگے نکل آیا تھا۔ اس دوران میں اُس کے دو بچے ہو چکے تھے، اور دوسرا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہوا تھا کہ اُسکی حق تلفی کر کے ایک ایسے شخص کو ہیڈ کلرک بنا دیا گیا تھا جو بی۔ اے فیل تھا۔ اور اُسکے بعد ملازم ہوا تھا۔ پانچ چھ مہینے سے اُس کی خود اطمینانی رخصت ہو چکی تھی۔ اُسکے اعضا میں اضمحلال آ گیا تھا، اور وہ اپنے آپ کو ادھیڑ اور شکستہ تصوّر کرنے لگا تھا۔ روشنی کا مینار ڈھ جانے سے اُس کے مستقبل پر دُھندلکا چھا گیا تھا جس میں بچّوں سے متعلق ذمہ داریاں، دوسرے دُنیاوی فرائض اور ان سب کے پورا کرنے میں دشواریاں اُسے حقیقت سے کئی گُنا بڑی دکھائی دینے لگی تھیں، اور اُس کا سر ان باتوں سے بھرا رہتا تھا۔ اپنے بچّوں سے بھی اُسے دلبستگی باقی نہ رہی تھی، اور وہ بیوی کو بھی فضول خرچی کا الزام دینے لگا تھا۔ باتونی بھی وہ بلا کا ہو گیا تھا، اور محلے والوں میں بیٹھ کر گھنٹوں اپنی حق تلفی، ہیڈ کلرک کی بے ایمانی اور رشوت ستانی کی

شکایتیں کیا کرتا تھا۔ مستقبل سے خوف زدہ اور حال سے بیزار ہو کر وہ ماضی کی تاریکیوں میں بھی جھانکنے لگا تھا، اور اُسے پہلے تو دُھندلی پرچھائیاں اور پھر کبھی کبھی نیم روشن تصویریں نظر آنے لگی تھیں۔ بیتے ہوئے دِنوں کیلئے اُس کے دل میں کوئی ٹیس نہ اُٹھتی تھی، بس متفرق اور بے جوڑ تصویریں کوئی جذبہ پیدا کئے بغیر اُسکے سامنے سے گزرتی رہتی تھیں۔ آخر خزاں کے پتّوں کی طرح ہوا پر بھٹکتی رہنے والی ان ہی تصویروں کے ساتھ ایک مرتبہ یہ یاد بھی آئی کہ اُس نے ملازمت سے پہلے ایک لڑکی کو خط لکھا تھا۔ پہلے تو وہ اِسے ایک ناتجربہ کارانہ حماقت سمجھ کر ہنسا، مگر آہستہ آہستہ اُسکے جسم میں سنسنی پھیلتی گئی، اور وہ اُتنا ہی مشتعل ہو گیا جتنا کہ وہ خط لکھتے وقت تھا۔ تعجب، مایوسی اور اُمید کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اُسکے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ انجلا کو اُس کا خط ملا تھا یا نہیں؟ اُس نے خط سے کیا اثر لیا؟ اُسکے گھر والوں کو تو پتہ نہیں چل گیا؟ کہیں انجلا کا خط ڈاک میں تو نہیں کھو گیا؟ اُسکی عقل جتنا زیادہ شک کرتی تھی اُس کا دل اتنا ہی زیادہ اپنی نسیں اُس خط کے گرد لپیٹتا جاتا تھا، اور اب اتنی مدّت کے بعد جواب پالینا اُسے بالکل یقینی نظر آ رہا تھا۔ شاید انجلا کی شادی نہ ہوئی ہو، یا اُسکی اپنے شوہر سے نہ بنتی ہو، اور وہ اسی کی طرح شکستگی اور کسی ہمدم کی ضرورت محسوس کر رہی ہو۔ شاید پُرانے دنوں کی یاد اُسے ستا رہی ہو اور وہ اپنے کسی پرانے ساتھی کی تلاش میں ہو اور وہ اپنے گذشتہ طرزِ عمل کی معافی مانگتے ہوئے اُسے خط لکھے۔ غرضکہ سینکڑوں امکانات تھے، اور اُسے یہ سب اتنا منطقی معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے گھر بھی لکھ دیا کہ اگر اُس کا کوئی خط آئے تو فوراً اُسکے پاس بھیج دیا جائے۔ اور اُس نے بے چینی سے ڈاک کی راہ تکنی شروع کر دی۔ اُسے خط لکھنے والا ہی کون تھا، بس کبھی کبھار کسی عزیز کے یہاں سے خوشی یا غمی کی اطلاع یا اور ایسی ہی معاملاتی چیزیں۔ لیکن اس سے اُس کی اُمید نہیں مُرجھائی۔ اُس کے لئے ہر آنیوالا کل گزرتے ہوتے دن سے زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ اب جبکہ اُسکے سامنے ایک معیّن چیز تھی، وہ انتظار کر سکتا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں میں، اپنے گھر اور اُسکے ساز و سامان میں ترمیمیں سوچا کرتا

تھا تاکہ اُنہیں اینجلا کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔ ڈاڑھی بنانے سے وحشت کی وجہ سے پہلے اُس نے ڈاڑھی رکھ لینے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اب اُس نے یہ خیال چھوڑ دیا۔ وہ اینجلا سے بہت ہی پاکیزہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا، مگر ڈاڑھی پھر بھی کوئی قابلِ نمائش چیز نہ تھی۔ وہ صرف اینجلا کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنا چاہتا تھا، خواہ وہ ادب اور سیاست پر ہی سہی۔ اُسے اپنی کم علمی کا اعتراف تھا، اور اُس نے بارہا اس کمی کو دور کرنے کا ارادہ کیا، مگر اس کی مصروفیت اسے پورا نہ ہونے دیتی تھی۔ اینجلا کے جواب پر غور کرنا اور اُس کی بنیاد پر رنگین محل تعمیر کرتے رہنا اُس کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا تھا۔ اگر اُسے کبھی دفتر میں اُس کا خیال آ جاتا تو خوشی اور مسکراہٹ اسکے چہرے سے اُمنڈنے لگتی، وہ رجسٹر پر جھک کر اسے زور سے دبا لیتا، اور عمدہ سے عمدہ کام کرنے کے جوش میں اُسے بارہا لکھنا اور کاٹنا پڑتا۔ اُسکے چہرے کی سُرخی ہیڈ کلرک کی نظروں سے چھپی نہ رہتی، اور وہ طنزیہ مسکرا کر پوچھتا: "کیوں مولانا، کیوں کھلکھلاتے پڑ رہے ہو؟ لڑکا ہوا ہے کیا آج؟" اور وہ جھینپ کر جلدی سے جواب دیتا: "نہیں تو کچھ بھی نہیں!" اور پھر یہ سوچے بغیر کہ اُس کا یہ فعل اُسکے قول کی تردید کر رہا ہے، کوٹ کی جیب سے ڈبیہ نکالتے ہوئے کہتا "لو پان کھاؤ"۔ اُس دن وہ ہیڈ کلرک سے خوش خلقی سے پیش آتا اور گھر لوٹتے ہوئے بچوں کیلئے مٹھائی لے جانا نہ بھولتا۔ اینجلا کے چاروں طرف سے ماضی کا گھیرا چھٹنے لگا تھا، اور وہ اینجلا کی شکل و صورت، چال، ہنستے ہوئے ہونٹوں، کپڑوں، چوڑیوں، اُسکی ذرا ذرا سی حرکت، یہاں تک کہ ہر اُس دن کو جب وہ اُسکے سامنے آئی تھی، اتنی صفائی سے دیکھ سکتا تھا جیسے یہ سب کچھ اُسکے سامنے موجود ہو۔ اینجلا کی ہستی اُس کیلئے اتنی گہری اور حقیقی ہو گئی تھی گویا وہ دونوں برسوں ساتھ رہتے تھے۔ اب اُس کی زندگی میں اُس سڑک پر قدم گونج رہے تھے جس پر وہ کبھی چلا ہی نہ تھا۔ اور یہ گونج اتنی مدہوش کن تھی کہ اس میں اُسکی ساری پریشانیاں اور شکایتیں، یہاں تک کہ وقت کے پیروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی ڈوب گئی تھی۔ چھ بھاری بھرکم سال اُسے روندتے کھوندتے گزر گئے تھے، مگر وہ اپنے اوپر اُن کا کوئی اثر

نہ دیکھ رہا تھا۔ خوابوں کی نمی اور طراوت اُسے ہرا بھرا بنائے ہوئے تھی۔

یہ نہیں کہ اُس کی زندگی میں تلخی کا گزر ہی نہ ہوتا ہو۔ کبھی کبھی ایسے دن بھی آتے تھے، جیسے کہ آج تمام دن ہیڈ کلرک اپنے طنزیہ جملوں سے اُسے چھلنی کرتا رہا تھا اور اتفاق سے کام بھی اُسکے سر بہت آ پڑا تھا۔ وہ دیر سے گھر لوٹ رہا تھا اور بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ ہر تھکے ہوئے قدم کے ساتھ اُس کا ملازمت چھوڑ دینے کا عزم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بازار میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھا پکڑ کر اُسے روکا۔ وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس دُہری ٹھوڑی والے گورے آدمی کی شکل میں اپنے کلاس کے ساتھی مقبول کو اُس وقت تک نہ پہچان سکا جب تک کہ اُس نے مُسکرا کر "کہو کیسے ہو؟" نہ کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مقبول پر قسمت کی دیوی زیادہ مہربان رہی ہے اور محض ایک شناسا کو اتنی بے تکلفی سے مخاطب کرنے کے معنی تھے کہ وہ یہی جتانا چاہتا ہے۔ بہرحال اُس نے اپنے حواس جمع کئے اور گرمجوشی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا: "اخاہ، آپ ہیں! یہاں کیسے؟"

ایک فیشن ایبل مصافحہ کے بعد مقبول نے بتایا کہ وہ بینک کا ایجنٹ تھا، اور اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ مقبول سے رسمی معلومات تبادلہ کرنے کے دوران میں وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے گھر لیجائے یا نہ لیجائے کہ مقبول نے خود ہی تجویز کیا کہ وہ کسی ریسٹوران میں چلیں تاکہ کچھ دیر باتیں کر سکیں۔ یہاں کے اکیلے ریسٹوران "رائل ہوٹل" کے اخراجات کے بارے میں، جسے انٹر کالج کے طلبا کی سرپرستی حاصل کرنے کیلئے سلطنت برطانیہ والا کر یہ نام دیدیا گیا تھا، اُسکے خیالات بڑے دل دہلا دینے والے تھے۔ وہ صرف ٹوٹی ہوئی کرسیوں والی معمولی سوڈا واٹر کی دکان تک ہمت کر سکا، اور وہ بھی معذرت کے ساتھ۔ مگر مقبول اُسے لتاڑنے پر تُلا ہوا تھا۔

اُسکے پاس باتیں کرنے کیلئے کیا تھا، اپنا وہی معمولی رونا گانا، اور اُسے بھی مقبول کے کپڑوں کی چمک نے غیر مناسب بنا دیا تھا۔ مقبول البتہ بھرے ہوئے گلاس سے جیسے اُس نے

ابھی تک اپنے ہونٹوں سے نہ چھوا تھا، کمیل کمیل کر اُن پرانے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا جن سے وہ اِس عرصے میں ملا تھا۔

باتیں سُنتے سُنتے دفعتہً اُس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی، اور اُس نے مقبول کی بات کاٹ کر لفظ چباتے ہوتے پوچھا: "اور ہمارے ساتھ ایک لڑکی بھی تو تھی، کیا نام تھا اُس کا؟ اینجلا، اور آگے نہ معلوم کیا؟"

"اوہ، وہ اینجلا کوکس!" مقبول نے کہا: "سب سے پہلا بیمہ میں نے اُسی کے شوہر کا تو کیا تھا۔ اُس کی شادی ایک بڑے امیر ڈاکٹر سے ہو گئی تھی۔ مگر کالج سے نکل کر بیچاری ایک سال بھی تو زندہ نہ رہ سکی۔ بچہ ہوا تھا اُس کے، اُسی میں مر گئی۔ کیا اعتبار ہے زندگی کا! اب آفتاب ہی کو لو۔ کیسا چُلبلا تھا! ساری کلاس کو لُٹا لُٹا دیتا تھا مارے ہنسی کے.... خوب دن تھے وہ بھی!"

باجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی ۲۴ رستمبر ۴۲ء

وہ تین

پتّے دو منٹ بھی چین سے نہ رہے تھے کہ ہوا نے اُنہیں پھر کھڑکھڑانا شروع کر دیا۔ برآمدے کے کیلب والے نصف حصّے کی شامیں یوں ہی کون سی کم دھندلی، اُداس اور طویل ہوتی تھیں، مگر پتّوں کی پیہم سرسراہٹ، جو گرمیوں میں غضب ناک جھکّڑوں میں تبدیل ہو جاتی تھی، اور گرجا کے گھنٹے کی غیر متوقع اور اضطراری ٹناٹن تو اُنہیں اور بھی بے نور، افسردہ اور گراں بار بنا دیتی تھیں۔ یہ آوازیں رُکے بغیر اُن کے اندر پھیلتی ہی چلی جاتی تھیں، جو کچھ بیچ میں آئے اُسے سمیٹتی، تحلیل کرتی، فنا کرتی۔ اور اُنہیں اپنے اندر کا خلا اور بھی وسیع و عریض، اور بھی عمیق، اور بھی بیکراں معلوم ہونے لگتا تھا۔ گرجا کا گھنٹہ تو خیر کبھی کبھی کی بات تھی، لیکن پیپل کے پتّوں میں تو ہوائیں ہر وقت آہیں بھرتی رہتی تھیں۔ خصوصاً اس دفعہ کی آہ تو اتنی لمبی، آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی اور دلدوز تھی کہ جیسے وہ پیڑ، خود وہ زمین جس میں پیڑ لگا ہوا تھا اپنا آخری سانس لے رہی ہو۔ کم سے کم ان تینوں نے تو اپنی رگوں میں سے سانس نکلتے اور اپنے آپ کو پتھر بنتے محسوس کیا تھا۔ سانس واپس لینے کے بعد بھی وہ کانوں پر زور ڈال ڈال کر یہ دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اُن کے اعصاب واقعی زندہ ہیں یا نہیں۔ اور اُنہیں اپنے چاروں طرف کی دُنیا کچھ اجنبی اور ناقابلِ یقین سی

معلوم ہوتی رہی۔ وہ بالکل کھوسے گئے تھے۔ جیسے اُنہیں کسی دوسرے کرّے میں جلاوطن کر دیا گیا ہو۔

میتھلڈا تو اتنی بے اعتبار تھی کہ اُس نے اپنی ٹانگ کو اسکرٹ سے آزاد کر کے تھوڑا سا آگے پھیلایا، یہ جاننے کے لئے کہ اُس کی پنڈلی کا پلپلا اور دُکھتا ہوا گوشت کہیں ٹھنڈک کا احساس تو نہیں کھو بیٹھا۔ مگر خشکی کے داغوں والی اس تھل تھل پل پل کھال کو تر کے ہلدی جیسے رنگ میں اب سیاہی رل چکی تھی اُس کی آنکھیں برداشت نہ کر سکیں اور اُس نے ٹانگ کو پھر چھپا لیا۔

سامنے سڑک پر دُھوپ کے دھبّوں کو، جن میں زردی تو برائے نام ہی تھی اور اصل رنگ برف جیسا سفید تھا، نا اُمید نظروں سے دیکھتے ہوئے کیلب نے اپنے آپ کو کرسی میں اُوپر کھینچا، اور سوچا، کب تک چلے گی آخر یہ سردی؟ ٹھنڈک کی اس رو کو بیس دن ہو چکے تھے اور وہ کسی طرح ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وہ اُس کی ہڈی ہڈی میں بیٹھتی چلی گئی تھی، اور اب اُس کے اعضا ایسے جم گئے تھے کہ ذرا سا ہلانے میں ٹوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ روز یہی سوال پوچھتا رہا تھا، اور سردی اُس کے سوال پر غور کئے بغیر چلتی چلی گئی تھی ـــــ اُس کی ہڈیوں میں اور نیچے، اور نیچے۔ اُس نے اپنی گردن پھر گریبان میں جھکا لی، اور یہ تصوّر کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جاڑے کی تہیں اُسکی ہڈیوں پر کیسے سفید سفید کھریا کی طرح جمتی چلی جا رہی ہونگی، ہڈیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہوئی۔

پتّوں کی آہ نے اِن دونوں کو تو صرف سُن ہی کر دیا تھا، مگر نینسی کو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی نے اُس کا دل مسل ڈالا۔ یہ جھونکا دُھوپ سے چمکتے ہوئے گولف کے میدان کو اُس کے انگریزوں اور کیڈیوں سمیت اپنی جگہ سے اکھاڑ کر دُور فضاؤں میں اُڑا لے گیا تھا، نہ معلوم کہاں، اور اب اُس کی جگہ لایعنی دُھند چکّر کھانے لگی

تھی۔ یہی آسا تھی جس نے سارے دن اُس کی کمر مضبوط رکھی تھی، اور وہ اسی کی مدد سے
صبح منہ دھونے اور پڑھنے کے غیر شخصی معمول سے لے کر اسکول کے نیم تاریک کمرے،
کتابوں، کاپیوں، سوالوں، تاریخوں اور ٹیچروں کی ساری بے رنگیاں سہار لے گئی
تھی۔ لیکن جب اس نے وہ آہنی گھڑیاں ایک ایک کر کے کاٹ دیں اور گولف کے
میدان کو اتنے قریب محسوس کر کے اُس کا دل خوش یقین اُمید اور مسرّت سے
دھڑکنے لگا تو ان جھونکوں نے قضائے مبرم کی طرح سر پر منڈلانا شروع کر دیا۔ وہ
صاف دیکھ سکتی تھی کہ اس وقت گولف کے لمبے چوڑے میدان کا ایک ایک ڈھلان،
ایک ایک پیڑ، کالے پالش والا ہرا ہرا ڈنڈا، گھاس کی ہر ہر پتّی اور ہر ہر پھول دھوپ
میں جگمگا رہا ہوگا۔ سورج کی ننھی ننھی ہنستی کرنیں گھاس کی کومل ڈنڈیوں پر پھسل
رہی ہوں گی، اور وہ اُن کے بوجھ سے ہلکے ہلکے کانپ رہی ہوں گی۔ جب ہوا اُن کی
جڑوں کو گدگداتی ہوئی چلتی ہوگی تو یہاں سے وہاں تک سارے میدان میں سفید
سفید پھول جوش سے اپنے سر ہلانے لگتے ہوں گے۔ میدان کے پار ٹیلوں تک پھیلے
ہوئے دریا کے شفاف ریت پر جگہ جگہ چاندی کے فوّارے چھوٹ رہے ہوں گے، اور
مست ہو ہو کر اچھلتے ہوئے بھیڑ کے بچّوں کے پیچھے زرّیں غبار اُڑ رہا ہوگا۔ انگریز عورتوں
کی زرد اور نیلی جرسیاں اور نیلے پتلون، مضبوط برہنہ پنڈلیاں اور بازو، جنہیں دیکھنا
نینسی کو اتنا پسند تھا، اُن کے سنہرے بال اور دھوپ سے تمتماتے ہوئے رخسار،
بڈھے کرنلوں کی تمباکو کے دھوئیں سے زرد مونچھیں، اور چکنا صاف سر، ان سب کی
چمک اور دلآویزی دوچند ہو گئی ہوگی۔ جب وہ گیند کو مارنے کے لئے اپنا کلب
اُٹھاتے ہوں گے تو فضا میں ستارہ سا ناچ جاتا ہوگا۔ وہاں کی نرم نرم دھوپ
بدن کو گرم کر دیتی ہوگی؛ ہوا میں سردی نام کو نہ ہوگی، اور وہ ہلکے ہلکے ناک کو گدگداتی
ہوئی کتنی خوشگوار معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن نینسی اور گولف کے میدان کے درمیان

پیپل کے پتّوں میں ہوا کی سنسناہٹ کا گرداب حائل تھا جس میں سے چاہے وہ ہزار ہاتھ پیر مارے کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ شاید کسی کو لوہے کی دیواریں بھی اتنا مقیّد نہ رکھ سکی ہوں جتنا یہ غیرمرئی لہریں نینسی کو۔ تین دن سے اُس کی شامیں اِسی بے رونق برآمدے میں برباد ہو رہی تھیں۔ دروازے کی محراب پر تو خیر کچھ روشنی رہتی بھی تھی، مگر پیچھے کی طرف تو اتنا دُھندلا دُھندلا رہتا تھا کہ آنکھیں اُس سے جدوجہد کرتے کرتے دُکھنے لگتی تھیں، اور شام کے ساتھ ہی ساتھ یہ دُھندلاپن اور گرانی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ جو اعضا اسکول میں لکڑی کی کُرسی پر دن بھر بیٹھے بیٹھے درد کرنے لگتے تھے اب لوہے کی کُرسی پر بالکل شل ہو جاتے تھے۔ بے جوڑ خیالوں کی پینک میں اُونگھتے رہنے اور احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو یا اِدھر اُدھر دیکھتے رہنے سے شام اور بھی جاڑ ہو جاتی تھی اور کاٹے نہ کٹتی تھی۔ ایک اور ایسی ہی شام گزارنے کے خیال سے اُسے اتنی کوفت اور جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ وہ اپنے خون میں آگ کے پتنگے تیرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اپنا دل ہلکا کرنے کے لئے وہ کسی پر بگڑ پڑنا چاہتی تھی، مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ کس پر۔ صرف اُس کے اندر ہوا کے جھونکوں کے خلاف ایک ذاتی عداوت کا جذبہ اُبل رہا تھا۔

میتھلڈا کسی نہ کسی طرح اپنی توجہ اپنی ٹانگوں کی طرف سے ہٹا کر بنرجی لوگوں کے بنگلے کی طرف مرکوز کر دینے میں کامیاب ہو گئی تھی، گو یہ خیال بھی کبھی کبھی اپنا سر کالے پانیوں میں سے اُوپر اُبھار دیتا تھا، اور میتھلڈا لپک کر اپنے گرد و پیش کے عکسوں سے اُسے پھر دبا دیتی تھی۔ آج مس بنرجی کی سہیلی آئی ہوئی تھی، اور دونوں بیڈمنٹن کے بلّے لئے ہوئے سارے لان پر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ ان دونوں کو کبھی ایک جگہ قرار نہ آتا تھا، پُھدکتی ہی رہتی تھیں وہ برابر، اور یہ میتھلڈا کے لئے بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ کم سے کم وہ اسے پسند نہ کر سکتی تھی۔ اسی طرح وہ اپنے بالوں کو برابر کر کے نہ باندھتی

تھیں، اور دو چار بالوں کو ماتھے پر آڑتے رہنے دیتی تھیں۔ لیکن مسز بنرجی کو بہت فخر تھا اپنی بیٹی پر۔ وہ ہر ایک سے کہتی رہتی تھیں: "ابھی پورے اٹھارہ کی بھی نہیں ہوئی مگر انٹر میں پڑھتی ہے" اور یہ کہتے ہوئے وہ کتنی اوچھی معلوم ہوتی تھیں۔ میتھلڈا کئی ایسے موقعے یاد کر سکتی تھی کہ جب اُس نے مس بنرجی کی بائبل ہسٹری کی غلطیاں پکڑی تھیں، مگر اس خیال سے نہیں جتایا تھا کہ کسی کو شرمندہ کرنے سے کیا فائدہ۔ اور آنکھیں تو وہ ایسی پھڑکاتی تھی کہ اتنی دُور سے بھی میتھلڈا اُن کی ہر حرکت کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اتنی زور سے بول رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی جیسے اپنی آواز سے خود لُطف لے رہی ہو۔ اس مشاہدے سے سبق اخذ کرنے کی فکر میں میتھلڈا نے ٹھیکرے کی طرح، جس کا ایک ناول چند دن ہوئے اُس کے ہاتھ پڑ گیا تھا، کوئی بات کہنے کی کوشش کرتے ہوتے سوچا کتنی عیّار اور مغرور ہوتی ہے خوبصورتی! اس مقولے کی گہری فراست اُس کے سر کے گرد ایک ہالے کی طرح پھیل گئی، اور وہ اسکی سچّائی پر وجد کرنے لگی۔

کیا سردی سے ہڈیاں سُوجنے لگتی ہیں؟ کیلب نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا وہ اس حد تک سُوج سکتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جُڑی نہ رہ سکیں، اور اُن کے جوڑ ٹوٹنا شروع ہو جائیں؟ اگر اُس کی ہڈیاں چاروں طرف سے پھولتی چلی آئیں، دیواروں کی طرح بڑھتی ہوئی، اور اُس کے دل، کلیجے، پھیپڑے، انتڑیوں، سب کو بھیں کر رکھ دیا، تو؟ کیا اس شکنجے میں دب کر اُس کی آنتیں تانت کے سُوکھے ہوئے ٹکڑے بن جائیں گی؟

خوبصورتی چند روزہ ہے، میتھلڈا نے ٹھیکرے کی طرح دوسرا جملہ سوچا۔

اپنے دماغ کی انتہائی قوت سے کام لینے کے باوجود نینسی کو اس قید سے رہائی پانے کی کوئی ترکیب نہ سُوجھ رہی تھی۔ گو مس بنرجی اُس سے بات کرنے کی حد تک

کبھی نیچے نہ اُترتی تھی، مگر نینسی اِس وقت اِن تمام باتوں کو درگزر کر کے اُس کے ساتھ کھیل میں شامل ہونے پر تیار تھی کیونکہ وہاں لان پر یہاں سے زیادہ روشنی اور سبزی تھی۔ لیکن اِس تین سال کے عرصے میں لوگوں سے اُن کی راہ و رسم اتنی کم ہوتی چلی گئی تھی کہ اب تو انہیں پہچانا بھی نہ جاتا تھا، اور انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا جاتا تھا۔ کوئی بھی گھر قریب میں ایسا نہ تھا جہاں خندہ پیشانی سے اُس کا خیر مقدم کیا جاتا۔ میٹلڈا بھی کسی کام کی نہ تھی، ورنہ وہ دونوں ٹہلنے جا سکتی تھیں۔ اُس کی ٹیڑھی ٹانگیں اُسکی مرضی کے خلاف چلتی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ سیر سے واپس آ کر ہمیشہ تھک جانے کی شکایت کیا کرتی تھی۔ اگر اُسے اجازت دے دی جاتی تو نینسی اکیلی بھی جا سکتی تھی، بلکہ اس کا تو اُسے بڑا شوق تھا۔ وہ روز کی طرح سر لٹکائے تھکے بیلوں کی طرح کھسکتی ہوئی نہ جاتی بلکہ تیز تیز، آزادی سے چاروں طرف دیکھتی۔ اور نہ وہ گولف کے میدان کے کنارے والے ٹیلے پر پہنچتی۔ وہ سورج کی کرنوں کو اپنے بالوں میں بنتی ہوئی گھاس پر دوڑتی، جوتا اُتار کر ننگے پیر چلتی اور تلووں میں تنکوں کی گدگدی سے مسکرا مسکرا دیتی، گھاس کے سفید پھول چنتی، کوئی سُن نہ رہا ہوتا تو کچھ گنگناتی، اور میدان کو طے کرتی ہوئی دریا کے ریت میں جا پہنچتی۔ وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ریت پر دونوں ہاتھوں میں اسکرٹ سنبھال کر ایسے چلتی جیسے پانی میں سے گزر رہی ہو، اُس میں ٹخنوں تک پیر گاڑ دیتی اور دیر تک اسی طرح بیٹھی لوٹتی ہوئی بھیڑ وں۔ ڈھلتے ہوئے سورج اور تیزی سے سفید ہوتی ہوئی ریت کی سفید چادر کو دیکھتی رہتی۔ وہ اتنی دیر میں گھر لوٹتی کہ پیڑوں کی سیاہی میں سے پھوٹتی ہوئی جھاؤنی کی روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹمانا شروع کر دیتیں، اور ہوا غروبِ آفتاب کے بعد کی، جب کہ ببول اور شیشم تک مہک اُٹھتے ہیں، شیریں خوشبوؤں سے لدی ہوتی۔ شاید وہ ستاروں سے نیم روشن آسمان کے خلاف سرخ گرجا کو بتدریج سارے منظر پر مسلّط ہو جانے والا ٹھوس سایہ بنتے

ہوتے دیکھنے کے لئے پل پر ٹھیر جاتی۔ کالج کے لڑکوں کی ٹولیاں ٹوٹ رہی ہوتیں۔ وہ اُسے دیکھ کر ہنستے، اور وہ بھی مُسکراہٹ سے اُن کا جواب دینے میں خسّت نہ برتتی۔ ہواؤں میں غیر مرئی دِیوں کی لوئیں پَٹ بیجنوں کی طرح چمک چمک کر اُڑ رہی ہوتیں، اور چاہے وہ لڑکوں میں مل کر نہ چل رہی ہوتی اور نہ اپنی آواز بلند کرتی، لیکن جنسوں کا سارا فرق بھول کر وہ اپنے جسم اور رُوح کے ساتھ اُن کے قہقہے میں شامل ہو جاتی کیونکہ یہ وہ عالمگیر اور ملائم قہقہہ تھا جو سورج چھپنے کے بعد زمین کی سطح پر لہریں لینے لگتا ہے، اور جیسے آدمی، پیڑ، پتھر سب ایک دوسرے کے جسموں میں برقی رو کی طرح بھیجتے رہتے ہیں۔ وہ شام کے نیلے آسمانوں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پر پھیلاتے اُڑنے والی ابابیل ہوتی۔ لیکن اُس کے پروں کو ایک طرف سے تو ڈیڈی کا لئے دبایا ہوا تھا اور دوسری طرف اُن سے بھی بوجھل مینھا ڈالے، اور وہ اِس برآمدے کی دُھندلی اور بے رونق حراست سے رہائی پانے کی بیتابی میں ہوا پہ اپنا سینہ دے دے مار رہی تھی....

نینسی کو اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ ڈیڈی کو اتنی سردی کیوں لگتی تھی۔ اسکول سے آتے ہی آتے اُس کے چہرے پر پسینہ آ گیا تھا، اور کمر پر چنگاریاں سی لگنے لگی تھیں، اور اُس نے گھر پہونچتے ہی کوٹ اُتار پھینکا تھا۔ مگر وہ اپنے کوٹ اور مفلر کے باوجود سکڑے جا رہے تھے، اور باہر نکلنے کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ انکا کوٹ پرانا ہی، مگر موٹا تو تھا۔ نینسی کا خیال تھا کہ اُس کی تو کھلی بانہیں بھی سردی نہیں محسوس کر رہی تھیں، اور اُس کے ہونٹوں پر ناخونوں کا سرد اور منجمد لمس بہت فرحت بخش معلوم ہو رہا تھا۔ شاید ڈیڈی کو موسم کا صحیح احساس ہی نہیں تھا، جب وہ احساس کی ایک ڈگر پر پڑ جاتے تھے تو انہیں وہاں سے نکالنے کے لئے اُن کے تخیّل کو جگانا پڑتا تھا۔ نینسی نے تجربے کے لئے اپنے سویٹر کو کمر سے کھینچتے ہوئے کہا،

"کچھ گرمی سی ہے آج تو!"

"گرمی؟ خون جما جا رہا ہے!" کیلب نے تیکھی غراہٹ کے ساتھ کہا، جس کی وجہ درحقیقت اُس کے سینے کا بلغم تھا۔ سردی کی شدت اُس کے دل میں ہمیشہ بیوی کے داغ کو تازہ کر دیتی تھی؛ وہ پھر اُسے یاد کر رہا تھا۔ جب وہ زندہ تھی تو اُس کی ہڈیوں کو کتنا آرام ملتا تھا۔ اُن دِنوں کے خیال ہی سے اُن میں سکون سا پھیلتا معلوم ہوتا تھا۔ انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر تو خیر کوئی بھی اُس کے پاس رکھ سکتی تھی، لیکن یا تو اب آگ میں سے حرارت ہی نکل گئی تھی، یا پھر اُس کی مرحوم بیوی کے وجود ہی میں سے گرم کر دینے والی لہریں نکلا کرتی تھیں۔ اُس زمانے میں وہ شام کو بھی اندر ہی رہا کرتے تھے، اُس کی بیوی کے گرد بیٹھے ہوئے جیسے مُرغی کے چاروں طرف اُس کے بچے۔ اور وہ باتوں کے بیچ بیچ میں رُک کر یہ دیکھتی جاتی تھی کہ سب آرام سے ہیں یا نہیں۔ لیکن اب اندر کی شامیں کیلب سے برداشت نہ ہوتی تھیں، اور اُسے اُن کے بجائے باہر کی سردی میں ٹھٹھرنا قبول تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی اُس کے گھٹنے دُکھتے رہتے تھے، اور اُس کی ہڈیاں ایسے گھن گھن کرتی تھیں جیسے اُن میں جھینگر بول رہے ہوں۔ کیا وہ اُس کی رگوں کا خون تھی؟ کیا وہ اُس کی زندگی کا سانس تھی؟

لیکن مستقلاً اُس کی ٹانگیں سردی سے بے خبر تھیں۔ یہ اعصاب بالکل مُردہ ہو گئے ہیں، اُس نے سوچا، بالکل سوت کے تاگے۔ گوشت کے گھل گھل کر ختم ہو جانے کے بعد بھی یہ تاگے سوکھی ہڈیوں سے لپٹے رہیں گے۔ ہڈیاں خاک ہو جائیں گی، مگر شاید یہ باقی رہیں گے —— یہ گونگے تار۔ کیونکہ موسموں کا اُن پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

کیلب کا برخاست ہو جانا اُس بچاری کے لئے اتنا بڑا صدمہ تھا کہ وہ اُسے

برداشت نہ کر سکی اور چھ مہینے کے اندر ہی مر گئی۔ اُن پریشانیوں میں اُس نے کیلب کو کتنا سہارا دیا تھا۔ اُس نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر یسوع سے دُعائیں مانگی تھیں، اور اڈئیوں کو کبھی پریشان نہ ہونے دیا تھا۔ اُن لوگوں کی دُشمنی اور دیدہ دلیری مضحکہ خیز حد تک پہونچ گئی تھی۔ رشوت کا الزام تو خیر، اُنہوں نے تو یہ تک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیلب کے اولاد ہی نہیں ہے۔ اگر پادری صاحب آڑے نہ آجاتے اور سرٹیفکیٹ نہ دیتے تو بہت ممکن تھا کہ اُسے یہ تھوڑی سی پنشن بھی نہ ملتی۔ اگر یہ جھگڑا نہ اُٹھ کھڑا ہوتا تو اب اُسے پورے تین سو ل رہے ہوتے، اور وہ بھی اُس سے جُدا نہ ہوئی ہوتی۔

اِس برآمدے کے خُون چُوسنے والے زرد اور پھیکے دُھندلکے میں، نینسی نے سوچا، وہ پیلی پڑتی چلی جائے گی، بُھوتوں کی مانند۔ گُھلتے گُھلتے وہ خواب کی صورتوں کی طرح دُھندلی رہ جائے گی، اور اُس کی آواز کنوئیں میں سے آتی معلوم ہوا کرے گی۔ وہ دیکھی بھالی شکلوں اور چیزوں کو بھی نہ پہچان سکے گی، اور انہیں بے تعلق، کچھ نہ سمجھنے والی، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہا کرے گی —— بشرطیکہ وہ کبھی اُس کے سامنے آئیں اُس کا تخیّل اِن دُھندلی زردیوں پر اپنا سر پٹخ پٹخ کر مر جائے گا اور اُسے راہ نہ ملے گی۔ اُس کے دماغ کے سیمیں پردوں پر کوئی تصویر نہ ہو گی، اور نہ اُس کی لاتعداد پیچ در پیچ گزرگاہوں پر خیالوں کے زلزلہ آفریں ریلے۔ گرد و پیش کی چیزیں، میتھلڈا، ڈیڈی، سب رفتہ رفتہ ہوا میں تحلیل ہوتے چلے جائیں گے، اور اُس کے اندر سر سے پیر تک لکڑی کی سی بُھوری دیواریں کھڑی ہو جائیں گی، جو ہر چیز کو آنے سے روک دیں گی۔ شاید وہ اُس وقت تک اِن تمام تبدیلیوں کو محسوس کرنا ہی چھوڑ دے گی! شاید اُس کا وجود محض ایک نظری دھوکا رہ جائے گا جس کے خد و خال ہوا پر اُبھرتے معلوم ہوتے ہیں اور دکھائی دینے سے پہلے پھر ہوا میں

جذب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُس کی منجمد آنکھیں پھر بھی سڑک پر سورج کی کرنوں میں کسی اَن دیکھے اور اَنجانے منظر کی راہ دیکھتی رہیں گی، اور اُس کے بیتاب کان پھر بھی کسی نامعلوم آواز کو سُن لینے کے لئے دُور سے آتی ہوئی صداؤں سے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ کیا کوئی ایسی آواز بھی ہوتی ہے جس سے ایک صدی کا طلسم باطل ہو جاتا ہو؟ کیا کوئی ایسا منظر بھی ہوتا ہے جس سے خُشک جھاڑیوں پر سُرخ سُرخ گلاب مہکنے لگتے ہوں؟

ٹانگیں لیا معنی، میتھلڈا کے چہرے تک پر سیاہی کے دھبّے پھیلتے جا رہے تھے، اور وہ سیاہی بھی ایسی جو بالکل بھینس کی کھال کی طرح بے رونق اور بے رنگ ہو۔ اُس نے پاؤڈر کو بھی آزما دیکھا تھا، مگر اُس سے سیاہی اور بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کے بدن کی طرح روز بروز چوڑا اور چپٹا ہوتا جا رہا تھا۔ بدن پھول جانے کے بعد بھی بعضے آدمی گول سے لُڑھکتے ہوتے بُرے نہیں معلوم ہوتے، مگر وہ تو ایسی لگنے لگی تھی جیسے اُسے پچکا دیا گیا ہو۔ اور یہ سب صرف چھتیس سال کی عُمر میں! ابھی اُسکے چہرے پر بُڑھاپے کے کوئی آثار نہ تھے، مگر پھر بھی اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا تھا کہ وہ نینسی کی بہن نہیں، ماں ہے۔ ٹہلنے میں اُسے جو لڑکے ملتے تھے اُنہیں بھی اُس نے یہی کہتے سُنا تھا۔ اگر نینسی کا رنگ زیادہ سُرخ تھا، اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مسکراتی معلوم ہوتی تھیں، اور میتھلڈا کے سے خدوخال، اُٹھی ہوئی ناک اور ٹیڑھی ٹانگوں کے باوجود وہ لڑکوں کی نگاہوں کو اس سے زیادہ متوجہ کر سکتی تھی تو کیا اِس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گیا کہ وہ نینسی کی ماں تھی؟ دراصل اُس نے کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے چہرے کی غور و پرداخت کا خیال ہی نہیں کیا ورنہ اُس کے چہرے پر بھی ویسی ہی آب ہوتی۔ چھتیس سال بھی کوئی عُمر تھی؟ یہ تو جوانی کا آغاز تھا۔ آخر ڈچز آو وِنڈزر نے تو بیالیس سال کی عُمر میں ایک دل پر فتح حاصل کی تھی۔ لیکن میتھلڈا جانتی تھی کہ اِن چیزوں کیلئے

دِل دکھانا غیر مناسب تھا کیونکہ خوبصورتی چند روزہ ہوتی ہے۔

اگر وہ زندہ ہوتی تو اُس کی خوش فہمی اور انتظامی قابلیت نے میتھلڈا کی شادی کے لئے اب تک کوئی راہ نکال ہی لی ہوتی۔ روپیہ نہ سہی، مگر وہ کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح سب ٹھیک کر ہی لیتی۔ خود کیلب کے بس کا تو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ لوگوں کو کیسے جتا سکتا تھا کہ اُس کی بیٹی ظاہر میں اوروں کے برابر نہ سہی، مگر وہ طبیعت کے لحاظ سے ہیرا تھی۔ وہ اتنی بے غیرتی کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ جو لوگ اُسے سلام تک نہ کرتے ہوں اُنہیں میں جا جا کر اُڑے، سلام تو الگ رہا وہ تو منہ چھپا چھپا کر اِن تینوں پر ہنستے تھے۔

کیا اب کوئی یقین کرے گا کہ آٹھ سال بھی نہیں ہوئے جب میتھلڈا ہینسنی ہی کی طرح سُرخ اور چست چالاک تھی، اور ویسے ہی کانوینٹ میں پڑھتی تھی؟ اور وہ پڑھتی ہی رہتی، اگر وہ مقدمہ پیچھے نہ لگ جاتا۔ شاید وہ ایم۔ اے تک تو ضرور پڑھتی۔ تب مسز بنرجی کو شیخیاں بگھارنے کا کوئی موقع نہ رہتا۔ مس بنرجی کی طرح ایک سہیلی پر اِترانا کیا، اُس کے کتنی ہی سہیلیاں ہوتیں، سب اُسی کی طرح تعلیم یافتہ، خوش پوشاک اور خوش وضع، مس بنرجی کی سہیلی سے بھی نازک اور خوشنما۔ وہ تو لڑکوں تک کو چائے پر بلاتی، اور اُس کے بعد سب پیانو پر گانے سُناتے۔ ایسے چھچھورے گانے نہیں جنہیں سننے کے لئے مس بنرجی اور اس قماش کی لڑکیاں چھٹی کے وقت کانوینٹ کی دیوار کے قریب جمع رہتی تھیں۔ اُنہیں دوپہر کو اپنی مسکراہٹیں دیوار کے پار نہایت فراخدلی سے بانٹتے ہوئے ہمیشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اور اُن کی وسیع مشربی رنگ و نسل کی ساری تخصیص اُٹھا دیتی تھی۔ جب میتھلڈا کانوینٹ میں پڑھتی تھی تو اینگلو انڈین لڑکوں تک کی سیٹیاں اور Serenade your [illegible] کی تانیں اُس کی آنکھوں کو متوجّہ نہ کر سکی تھیں۔ اُسے یاد نہیں تھا کہ اُس نے کبھی اُنہیں آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ہمیشہ دیوار سے دُور رہتی تھی، اور راستے میں کتاب پڑھتی ہوئی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں — Sister Enchantea

[illegible] تھیں۔ وہ شروع ہی سے پاک مریم کا اخلاقی سبق ذہن نشین کراتی تھیں۔ اُن کی نیلی چمکتی ہوئی آنکھیں، نورانی چہرہ اور فرشتوں جیسے سفید کپڑے دیکھ کر پاکیزہ باتوں کے علاوہ کسی اور طرف دھیان ہٹتا ہی نہ تھا۔ اب نہ تو ویسی تربیت ہی رہی تھی اور نہ ویسی لڑکیاں۔ اب تو تانگے میں جا رہی ہوں یا کلاس میں پڑھ رہی ہوں، خیال سائیکل کی گھنٹیوں کی طرف لگا رہتا تھا۔ اور تو الگ رہیں، خود اُس کی بہن نینسی اُس کے پیچ و تاب کھاتے رہنے اور مسلسل نگرانی کے باوجود کتابوں میں دل نہ لگاتی تھی۔ میتھلڈا کو معلوم تھا کہ نینسی ٹہلنے صحت کی غرض سے نہیں جاتی تھی بلکہ صرف اس وجہ سے کہ لڑکے پاس سے گزرتے ہوئے ملتے تھے۔ اسکول میں تو خیر وہ آنکھوں سے اوجھل رہتی تھی، مگر ڈیڈی تک کے سامنے اُسے لڑکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے سے لحاظ نہیں آتا تھا۔ کالجوں کے معمولی ہندوستانی لڑکوں تک کو گھورنے میں اُسے باک نہ تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں ناچ اُٹھتی تھیں اور ہونٹ بھینچنے کے باوجود مسکراہٹ اُس کے رخساروں اور ناک پر اُمنڈ آتی تھی اور میتھلڈا کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ جہاں شام کو اُن کے غولوں کے آنے کا وقت ہوا اور اُس نے سڑک پر نظریں دوڑانی شروع کیں۔ اور ٹہلنے جانے سے پہلے وہ اپنی کلائی پر سنہری گھڑی ضرور باندھ لیتی تھی۔ بلکہ میتھلڈا نے تو اُسے تمام حدوں سے بڑھ کر لڑکوں کی طرف زبان نکال کر منہ چڑاتے ہوئے تک دیکھا تھا۔ وہ نینسی کی رگ رگ سے واقف تھی۔

پادری صاحب، کیلب نے سوچا، وعظ میں ٹھیک کہا کرتے تھے کہ آدمی ایک تنکا ہے اور واقعی آدمی اس سے زیادہ کیا تھا! تھا ہی کیا آدمی کے بس میں؟ ہڈیوں کا آرام چاہیئے بس، اور سب تو خاک ہونے والی چیزیں تھیں۔ عیش و عشرت سے زندگی بسر کی جاتے یا افلاس میں، انجام ایک ہی ہونا تھا۔ اب مثلاً نینسی بار بار رنج جوتے

کے لیے ضد کرتی تھی کیونکہ اُس کا جوتا پھٹ چلا تھا اور اُس میں سے پیر نکل نکل جاتا تھا۔ فرض کیا کہ ایک نیا جوتا آ گیا، مگر چند دن بھی نہ گزریں گے کہ وہ بھی ٹوٹنے لگے گا۔ دُنیا کی ہر چیز ٹوٹنے لگتی تھی، جلدی یا دیر میں۔ وہ ہڈیاں ہوں یا جوتے۔ مگر نیلیتی بچاری ابھی بچّی تھی، اور اس کا کچّا دماغ اِن حقیقتوں پر غور نہیں کر سکتا تھا۔ اِن کے لئے ایک عُمر کے تجربوں کی ضرورت تھی؛ یہ اُس وقت نظر آتی تھیں کہ جب ہڈّیوں کے جوڑ ڈھیلے ہو کر ٹوٹنا شروع کر دیتے تھے۔

کمپاؤنڈ میں سورج کی روشنی تو نہیں، مگر ایک غائب ہوتی ہوئی چمک ابھی تک باقی تھی جسے تھوڑی ہی دیر میں دُھواں چوس لینے والا تھا۔ شام کے دو چار ریزے اب بھی جمع کئے جا سکتے تھے، اگر نیلیتی کو باہر نکلنے دیا جاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی آواز اِن اندھے کنوؤں میں نہیں گونج سکتی تھی، مگر شام اتنی تیزی سے اُسکے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی کہ وہ مشکوک لہجے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی: "باہر ہی ٹہلیں!"

تو گویا نیلیتی اب بھی یہی تجویزیں کر رہی تھی! لڑکوں کے آنے کا وقت تھا نا! وہ اُن کے انتظار میں چاروں طرف ٹہلتی پھرتی گی، کمپاؤنڈ کے قریب مہندی کی جھاڑیوں میں سے جھانکے گی، میتھلڈا کی آنکھیں بچا کر گلاب کا پھول توڑ لینے کی کوشش کریگی۔ کمپاؤنڈ ویسے ہی اُجاڑ پڑا تھا؛ بس ایک گلاب کا پودا رہ گیا تھا، اور اُس میں ایک پھول۔ اُسے بھی وہ نوچ پھینکنا چاہتی تھی۔ صرف میتھلڈا کی نگرانی نے اُسے اب تک نیلیتی کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا تھا۔ شاید وہ اُسے اپنے بالوں میں لگا کر لڑکوں کو دکھانا چاہتی تھی۔ میتھلڈا اُسے کتنی دفعہ اشاروں میں تنبیہ کر چکی تھی، مگر وہ ایسی بنجاتی تھی گویا سُن ہی نہیں رہی۔ اگر کوئی اپنی بھلائی کی بات نہ سمجھنا چاہے تو میتھلڈا کو اس پر ضد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، اور نہ ضرورت۔ مگر وہ اس کو کیا کرے کہ مسز اڈمنڈ ہر پھیرے میں اُسے نصیحت کر جاتی تھیں: "اب تم ہی ہو اس کی ماں، اور کون بیٹھا ہے!"

جب نیکی بدی کا الزام سب اُس کے سر آنا تھا تو پھر یہ اُس کا حق تھا کہ وہ نینسی سے اپنا کہنا منوائے۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ اگر نینسی باہر نکلی تو وہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ پھرے گی۔ وہ نینسی کی آنکھوں کے سامنے دیوار کی طرح حائل ہو جائے گی، اور سٹرک کو اُس کی نظر سے چھپا لے گی۔ نینسی اُس کا مقصد سمجھ جائے گی۔ مگر وہ جھجکے بغیر دونوں ہاتھ پھیلا کر ڈٹ جائے گی۔ دونوں ایک لفظ نہ بول رہی ہونگی، مگر دونوں کی آنکھوں سے چنگاریاں اُٹھ رہی ہوں گی۔ دونوں کے اندر بنیادی جانور جاگ اُٹھے ہوں گے۔ میتھلڈا انتقامانہ جوش سے پیچھا کر رہی ہوگی، اور نینسی ستم رسیدہ کی سی جھنجلاہٹ اور وحشت ناکی سے مدافعت۔ نینسی سینکڑوں داؤ چلے گی، مگر وہ اُن کے لئے پہلے ہی سے تیار ہوگی۔ چاہے یہ اندھی اور مجنونانہ مبارزت کتنی ہی دیر چلے وہ ہار نہ مانے گی۔ میتھلڈا اپنی حربی تدابیر ایسے ولولے اور اعتقاد کے ساتھ سوچ رہی تھی جیسے وہ کسی مذہبی جہاد میں حصّہ لینے والی ہو۔ اور واقعی وہ اپنے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ چکّر لگاتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

اِس بر آمدے میں کچھ بھی واقع نہ ہو گا؛ اُن لوگوں کے سر کا ایک بال تک نہ ہلیگا۔ میتھلڈا اپنے تاریک گوشے میں اور ڈیڈی ستون کے پیچھے اُس کے پروں کو دبائے بے حرکت بیٹھے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ سب مصر کی ممیوں کی طرح راکھ کی مورتیں رہ جائیں گے۔

اُس کی ہر ہر ہڈّی بولتی معلوم ہوتی تھی جیسے اُن میں جان پڑ گئی ہو۔ وہ بے گوشت پوست اور بدشکل، ڈراؤنے بونوں کی طرح اُس کے جسم میں چھپی بیٹھی تھیں جو ایک دوسرے سے ہر وقت کھسر پھسر سازش کرتے رہتے تھے۔

اور پھر ایسی سردی میں بغیر کوٹ کے پھرنے سے نزلہ ہو جانے کا اندیشہ تھا، اور نزلہ تو نمونیا کا پہلا قدم ہے ہی۔ اگر نینسی باہر گئی تو میتھلڈا ڈیڈی سے کہہ کر اُسے

بلوالے گی۔ وہ خود پکار کر کہے گی، "چلو، اندر آکر کوٹ پہنو۔ کہاں پھر رہی ہو ایسی سردی میں۔ نمونیا ہو جاتا ہے آج کل۔"

کیا یہ لازمی تھا کہ گرجا میں گھنٹہ ضرور بجایا جائے؟ اُس کی ہر ہر ضرب کیلب کی ہڈیوں پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ شاید گھنٹہ اُس کے جوڑوں کو اتنے دن بھی چلنے دینے والا نہ تھا۔

اوہ، شادی کی گھنٹیاں! جب سے میتھلڈا نے السٹریٹڈ ویکلی میں ایک مضمون "میں شادی سے نفرت کرتی ہوں" پڑھا تھا وہ جانتی تھی کہ شادی اور اسکی رسمیں کتنی مضحکہ خیز چیزیں تھیں۔ اور وہ اس وقت بھی ہنس سکتی تھی۔

گھنٹیوں کی آوازیں ہوا میں چمکدار فاختاؤں کی طرح قلابازیاں لگا رہی تھیں۔ بہنتی اس کا کوئی سبب دریافت نہ کر سکتی تھی کہ وہ لوگ گرجا کیوں نہیں جاتے تھے۔ آسے تو یہ آوازیں اپنے پروں پر بڑے کتھیڈرل کی طرف اُڑا نے لئے جا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ نشستوں کے درمیان اُس تاریک اور پُر اسرار راستے پر قربان گاہ کی طرف بڑھتی جائے، اور ان اونچی شمعوں کے بیچ میں مصلوب یسوع کے قدموں کے قریب جا کھڑی ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ برآمدے کے دوسرے حصّے میں بیٹھی ہوئی مسز فلپس اُن گھنٹیوں سے بہت لطف لے رہی تھی۔ اُس کی شادی کو چھ مہینے ہوتے تھے، اور جب سے وہ اس برآمدے میں بیٹھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ روز شام کو اوورکوٹ میں لپٹ کر کتاب ہاتھ میں لئے آ بیٹھتی تھی، اور ہر آواز پر چونک کر دیکھ لیتی تھی کہ اُس کا شوہر آ رہا ہے یا نہیں۔ اُسکے آنے پر وہ ایسے انداز میں مسکراتے ہوئے اُچھل پڑتی تھی جو میتھلڈا کو ہمیشہ غیر معقول معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے شادی میں وہ کیا غیر زمینی نعمتیں تھیں جن کی وجہ سے گھنٹیوں کی آواز تک اُسکے چہرے کو تمتماتے دے رہی تھی۔

کمپاؤنڈ میں سے چمک غائب ہو چکی تھی، اور جنگل کی طرف سے لوٹ لوٹ کر

دھواں اس طرف پھیلا جا رہا تھا۔ گلاب کے پودے کی ہریالی دھندلا گئی تھی، مگر پھول گہرا سرخ ہوگیا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں ننھی شام کی خوشبوئیں سونگھ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خوشبوئیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ اُن سے دم گھٹنے لگے گا، اور سڑک پر اتنا دھواں چھا جائے گا کہ مشکل سے وہاں کچھ نظر آسکے گا۔ اُس کی آنکھیں انتظار دیکھتی رہی تھیں، مگر سڑک ویسی ہی بھوری اور بے رنگ پڑی رہی تھی؛ اُس نے کان لگائے رکھے تھے، مگر اُس کے لئے کوئی آواز نہ گونجی تھی۔ کیا یہ اچھا نہ تھا کہ اُس کے گرد ہر چیز دھوئیں میں جذب ہوتی چلی جائے، اور کوئی آواز یا رنگ رہے ہی نہ جسے اُس کے کان سنیں اور اُس کی آنکھیں دیکھیں؟

آخر سردی نے ایک دکھائی دینے والی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ دھواں بنکر ہر طرف سے بڑھتی چلی آ رہی تھی، ہر لحہ قریب تر، نزدیک تر۔ یہ دھواں اُس کے جسم کے مسامات میں بیٹھتا چلا جائے گا، اور اُس کی ہڈیوں کے گرد فیتے کی طرح لپٹ جائیگا۔

میتھلڈا کی مدد کے لئے دھواں آپہونچا تھا۔ آج اب تک لڑکے نہ آئے تھے۔ اوّل تو اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اب اُن کے آنے کی اُمید ہی نہ تھی، اور اگر وہ آئے بھی تو دھواں انہیں اپنی تہوں میں چھپالے گا اور ننھی انہیں نہ دیکھ سکے گی۔ وہ اپنی ناکامیابی پر جھلا جائے گی اور ساری رات بے چین رہیگی۔

دھواں ہڈیوں کے گرد جم کر لوہے کے پتّروں کی طرح سخت ہو جائے گا، اور پھر اُس کے اعضا حرکت نہ کر سکیں گے۔ اُس کے اندر سناٹا چھا جائے گا، اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجسّے کی طرح ہوا کو گھورتا رہے گا، گھورتا رہے گا۔ اس آہنی دھوئیں کی وجہ سے اُس کا جسم گل کر خاک بھی نہیں ہوگا، بلکہ یونہی ہوا کو گھورتا رہے گا، برسوں، صدیوں ——— ہمیشگی کی ایک یادگار۔

دھوئیں میں رات کی تاریکی شامل ہو جائے گی ——— تاریکی جو بھینس کے

رنگ جیسے داغوں والی تھل تھل پل پل کھال اور انار جیسے رخساروں میں تمیز نہیں کرتی۔ وہاں نہ تو دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے نہ اپنے آپ کو۔ وہاں ہوتا ہے وہ مکمل امن اور سکون جو سمجھ سے باہر ہے۔

دھواں، دھواں، دھواں۔ اور اس کے بعد رات کی اندھی پہنائیاں۔ لیکن ..... کون کہہ سکتا تھا؟ شاید وہ جادو کی آواز دھندلکوں پر ہی اڑتی ہوئی آتی ہو! شاید وہ طلسمی منظر تاریکیوں کو چیر کر ہی ظاہر ہوتا ہو۔

ساقی سالنامہ جنوری ۴۳ء ۸ نومبر ۴۲ء

اِختتامیہ

جو باتیں عموماً کتاب کے شروع میں کہی جاتی ہیں میں نے انہیں آخر میں کہنا پسند کیا ہے کیونکہ ہر لکھنے والے کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ میری تعریف کریں۔ میں یہ باتیں سرے سے کہتا ہی نہ اگر میں صرف وقتی تعریف سے مطمئن ہو سکتا۔ مجھے کچی دھاتوں کے ایک ڈھیر کے بُوتے پر جوہری بننے کی خواہش نہیں ہے؛ ہاں، اگر اسے تپاتے تپاتے ——— اور میں آپکو بھی اپنی دھونکنیاں لانے کی دعوت دیتا ہوں ——— کچھ سونا نکل سکے۔ کھرا کھوٹا الگ کرنا تو درحقیقت آنیوالی نسلوں ہی کا کام ہے؛ لیکن میری آرزو ہے کہ میری نسل کم سے کم میرے کھوٹے کو کھرا نہ سمجھے۔ کیونکہ جو بُری بھلی پذیرائی میرے افسانوں کو حاصل ہوئی ہے اُسے دیکھتے ہوئے فی الحال یہی اندیشہ زیادہ ہے؛ اپنے کھرے کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے، اور نہ کسی لکھنے والے کو ہونی چاہیئے، اگر وہ ادب کی تاریخ سے واقف ہے۔ اِسی لئے میں اپنے افسانوں کے متعلق اپنی رائے محفوظ نہیں رکھتا، گو اپنے بارے میں مصنّف کی رائے دوسروں کی رائے سے لازمی طور پر زیادہ قابلِ وقعت نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی رائے آخر کے لئے رکھی ہے، کیونکہ میں آپ کے اور اپنے افسانوں کے درمیان آنا نہیں چاہتا، اور نہ پڑھنے سے پہلے آپکے دماغ کو ایک مخصوص تاثر قبول کرنے کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہی تاثر زیادہ قابلِ قدر ہے جو آپ آزادانہ قائم کریں؛ میری گزارشات تو محض تقابلی مطالعے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔

اُردو ادب کے موجودہ دَور کا ایلیزبیتھ کے زمانہ سے مقابلہ کیجئے، اِسے نشاۃِ ثانیہ کہیے، جو دعوے کیجئے مجھے سب تسلیم ہیں، میں اِس دَور کے مدّاحوں اور حامیوں میں سے ایک ہوں! اِس لئے شاید مجھے کچھ گستاخیوں کی اجازت بھی ہوگی. موجودہ ادبی تحریک، کم سے کم اپنے ابتدائی زمانے میں، اثبات نہیں بلکہ انکار کے دھارے پر آگے بڑھی ہے. یہ حقیقت ہے کہ ماحول میں اُسکے کافی سے زیادہ معاشیاتی، سماجی، سیاسی اور ادبی اسباب موجود تھے، لیکن توجیہ معاملے کو ختم نہیں کر دیتی، اور نہ جواز ثابت کر دینے سے کسی چیز کے نقصانات کم ہوتے ہیں. اِس انکاری رُوح نے نہ صرف فاسد [illegible] کو خارج کیا، بلکہ ادب میں نیا خون بھی دوڑا دیا، اور محسوسات و مدرکات کی نئی نئی سرزمینوں کو ممکن بنایا، لیکن ادب اور زندگی کی بہت سی بنیادی ضرورتوں اور حقیقتوں کی طرف سے بے اعتنائی بھی پیدا کر دی، اور یہ ایسا زخم ہے جو مدّت میں اور مشکل سے بھرتا ہے. اس تحریک کے (میری مُراد کسی خاص تحریک سے نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت سے) رُوحِ رواں ایسے نوجوان تھے (ہیں) جو تعلیم پا رہے تھے یا ابھی تعلیم ختم کر کے چکے تھے. فطری طور پر اِن نوجوانوں نے، زبانِ قلم سے نہ سہی، اپنی رُوح کی گہرائیوں میں ہر چیز سے انکار کیا، سوائے اپنی عظمت کے. میں مخصوص افراد پر الزام نہیں لگا رہا ہوں؛ بلکہ ایک عام فضا کا ذکر کر رہا ہوں. ایک عام نوجوان جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اِس احساس کے ساتھ کہ شروع سے لیکر اب تک اُردو کی ادبی تاریخ ایک خالی صفحہ ہے، اور وہ پہلی مرتبہ ادب پیدا کر رہا ہے. لیکن عظیم ادب پارے پیدا کرنے کے لئے اُن عظیم سائوں کا احساس ضروری ہے جو ہمارا راستہ روکتے ہوئے معلوم ہوں، بلکہ عظیم ادب پارہ پیدا کرنے کی خواہش ہی اُس وقت پیدا ہوتی ہے. میں بھی بڑی حد تک اس رنگ میں رنگا ہوا تھا، لیکن خوش قسمتی سے مجھے دَو رہنما ایسے مل گئے جن کے فیض سے میں نے احترام اور عظمت کے کھوئے ہوئے احساس کو دوبارہ پالیا. ان میں سے ایک الٰہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی کے ریڈر جناب ستیش چندر دیب صاحب ہیں. اُن کی تقریروں سے جو کچھ میں نے

سیکھا اُس کا تو ذکر ہی کیا؛ قدیم ادب کی جلیل القدر ہستیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں اور چہرے کی چمک، ابرو کا نیا آشانہ تناؤ، اور تقدّس و احترام کے مذہبی جذبے سے آواز کی تھرتھری کہ جب خود اُن کی ذات عظمت و رفعت اخذ کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ـــــ صرف ان ہی چیزوں نے میرے لاتعداد شبہے اور کج خیالیاں زائل کر دیں۔ اور یہی کچھ میں حضرت فراق گورکھپوری کے متعلق کہہ سکتا ہوں جو آج بھی اس جنس گراں کی پرستش کر سکتے ہیں جس کا بازار میں کوئی خواہاں نہیں۔ ان ہی قدموں کی برکت ہے کہ میں اپنی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا ہیں دیو قامت افراد کا وجود تسلیم کرتا ہوں، اور اُن سے اپنا قد ناپتا رہتا ہوں۔ اگر ہمیں اپنے ادب کو انسانی ترکے کا ایک حصّہ بنانا ہے تو ہم زیادہ عرصے تک اپنے آپ کو زمان و مکان میں محدود نہیں رکھ سکتے۔ ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بن سکتیں۔ اگر ہم اُردو ادب میں صرف نئی نئی راہیں کھول دینے پر ہی مطمئن نہیں ہیں، بلکہ واقعی "سونے کی سرزمینیں" فتح کرنا چاہتے ہیں تو جلد یا بدیر ہمیں نہ صرف اپنے پیشروؤں سے بلکہ ساری دُنیا کے بڑے بڑے نثر نگاروں اور شاعروں سے اپنا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ یہ کام آنیوالی نسلیں تو خیر کریں گی ہی، مگر وہ ہمارے لیئے بے فیض ہوگا۔ اس مقابلے اور موازنے سے پہلو بچانا گویا اپنے قد کو بڑھنے سے روکنا ہے۔

اس ہما ہمی اور گہما گہمی میں ہم ایک بات اور نظر انداز کر گئے ہیں، یعنی اُردو ادب کے روایتی دھاروں سے واقفیت ـــــ موضوعات اور اسالیب بیان دونوں چیزوں سے متعلق۔ ہم نے لکھنا تو شروع کر دیا مگر یہ سیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ لکھتے کیسے ہیں۔ یہ رجحان ایک طرح سے عالمگیر ہے، اور اس نے ٹی ایس ایلیٹ کو افسوسناک لہجے میں یہ خواہش ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہو کہ کسی طرح درسگاہوں میں خطابت (Rhetoric) کی تعلیم پھر سے شروع کی جا سکتی۔ مجھے اِس اندازِ نظر کی کمزوری کا احساس اُس وقت ہوا کہ تب میں منجدھار میں پہونچ چکا تھا۔ میرے دل میں اکثر یہ تمنّا پیدا ہوتی ہے کہ کاش مجھے

فلابیئر جیسا سخت استاد ملتا جو کبھی میرے لکھے ہوئے سے مطمئن ہی نہ ہوتا، بلکہ ہر دفعہ کاٹ کر پھینکتا اور پھر سے لکھواتا، تب ممکن تھا کہ میں واقعی ادب کی تخلیق کر سکتا۔ فی الحال میرے افسانوں میں ادب کا مواد تو بہت کافی موجود ہے، مگر وہ بذاتِ خود ادب نہیں ہیں...... روایت اور تجربات کو متعلق رکھنے کے لیے نئوں کو پرانوں کی یاد تازہ کراتے رہنے کے لیے، اور نئے رجحانات کے درمیان مصالحت ([illegible]) کا عمل انجام دینے کے لیے کسی ایسے بزرگ کا وجود لازمی تھا جس کا سب نوجوان احترام کر سکتے۔ لیکن اس وقت اردو میں کوئی ایسا آدمی موجود نہیں ہے۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ وہ آدمی نقاد ہوتا۔ میں کسی ڈکٹیٹر کی اہمیت بیان نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میرا مطلب صرف ایک ایسے آدمی سے ہے جس کی بات قابلِ قدر سمجھی جا سکتی۔ بس وہ حیثیت سمجھیے جو آج کل انگریزی میں ٹی ایس ایلیٹ اور فورسٹر کو حاصل ہے۔ غالباً اس فقدان کا سبب شعور کی تیزی ہے اور لٹریچر کو مضبوط درمیانی کڑی کے بدل جانا ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم ابھی تک اردو میں کوئی قوی تنقیدی تحریک پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ اردو ادب جہاں تک پہنچ چکا ہے اسے مجموعی حیثیت سے آگے بڑھانے کے لیے تخلیقی جوہر کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ ایک پُر از معلومات اور جاندار تنقید کی۔ اس تنقیدی تحریک کو تازہ ترین معاشی، سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی، عمرانی اور فلسفیانہ نظریوں سے مسلح تو ہونا ہی ہوگا، لیکن سب سے زیادہ اس کے لیے مغرب اور مشرق کی ادبی اور تنقیدی تاریخ سے پوری آگاہی لازمی ہوگی، اور ہر ادبی کیفیت اور انداز کا منبع و مخرج بتانا ہوگا۔ مختصراً، اس تحریک میں ڈبلیو پی کیر، ٹی ایس ایلیٹ، ارونگ بیبٹ، پول ایلمر مور، ٹرولیپ یاس دا' جیسے عناصر کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس تحریک کو خالص نفسیاتی تنقید اور دوسری طرف کروچے کی جمالیات اور اظہاریت (Expressionism) سے خطرہ لاحق ہوگا۔ ممکن ہے کہ میں ان چیزوں کو سمجھتا ہی نہ ہوں، لیکن میرے دماغ میں ان کا جو تخیل ہے اس کے مطابق یہ معیار قائم کرنے میں صرف ناکامیاب ہی نہیں ہوا ہوں بلکہ میرے

سے معیاروں کی ضرورت اور وجود ہی تسلیم نہیں کرتیں اور تقابلی مطالعے کو مہمل قرار دیتی ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت ادب اور آرٹ کو زندہ رکھنے میں کہاں تک معاون ہو سکتی ہو جب کہ اس قلمرو میں طوائف الملوکی کا یہ حال ہے کہ —— Surrealists کے نزدیک سڑک کا ہر وہ پتھر جو آپ کی پسند آجائے آپ کا تخلیقی کارنامہ ہے؟ یہ اگلا قدم نہیں ہوگا، بلکہ ہم اُس منزل تک پہونچ چکے ہیں کہ جہاں ادب اور ہذیانات میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کوئی حدِ فاصل نہیں رہتی۔ ادب کی شادابی، بلکہ زندگی کیلئے معیاروں کا دوبارہ قائم کیا جانا ناگزیر ہے۔ خصوصاً اُردو ادب میں جو درمیانی منزلیں طے کئے بغیر مغربی ادب کی موجودہ کیفیت تک پہونچنے کے لئے بیقرار ہے۔ بہرحال اس مسئلے میں میری دو رائیں نہیں ہیں کہ اب اُردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے.... لیکن تخلیق اور تنقید —— Creative Criticism اور —— Preciosity میں آکر ایک ہو جاتی ہیں۔ اوّل تو ہر لکھنے والے کو خود اپنے اوپر ہنسنے کی کوشش کرنی چاہیئے، ورنہ کم سے کم دوسرے تو موجود ہوں جو اُس پر ہنس سکیں۔ اور کسی ادبی دور میں Preciosity کا پیدا ہو جانا یقیناً صحت ورانہ علامت ہے۔ کیونکہ ہر ہنسی کی بنیاد کینہ اور دشمنی نہیں ہوتی۔ لیکن اِس قسم کی Preciosity کا رجحان بھی اُردو میں کنہیا لال کپور کے ایک آدھ مضمون سے باہر نہیں پایا جاتا۔ شاید ہم لوگ بہت سنجیدہ ہیں —— اپنے آپ کو بہت سنجیدہ سمجھتے ہیں۔

خیر یہ تو تھا اپنے زمانے کی ادبی فضا کے متعلق۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں ہئیت کا احساس ہے ہی نہیں۔ فنّی اور ہئیتی اعتبار سے میرے افسانے عجیب کالے کھدرے ہیں —— بالکل بیڈول، کانیں نکلی ہوئی۔ لیکن اس طبعی کمزوری کے باوجود میں کچھ ٹھونک پیٹ کر اُن کی شکل وصورت درست کرنے کی کوشش کرسکتا تھا، اگر قدرت نے مجھے تھوڑا سا صبر و سکون اور استقلال بھی دیا ہوتا۔ یوں افسانہ سوچنے اور لکھنے میں تو میں مہینوں لگاتا

ہوں، مگر یہ امر مشکوک ہے کہ یہ وقت واقعی جائز طور پر صرف ہوا۔ بہت سی خامیاں ایسی ہیں جنہیں میں دیکھتا بھی ہوں اور نکال بھی سکتا ہوں، لیکن اگر مجھ میں اپنا مسودہ دُہرانے کی طاقت ہوتی تو پھر میں اپنے مجموعے کا مقدمہ کسی مشہور ادیب سے نہ لکھواتا؟ تخلیق کا اُصول ہی یہ ہے کہ پہلے موضوع کو پوری شدّت کے ساتھ ایک چمکتے ہوئے نقطے کی طرح محسوس کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے رُوحانی کاوش کی ضرورت ہے جس سے بڑے بڑوں کو پسینے آجاتے ہیں، اور میں ٹھہرا سہل انگار اور تن آساں۔ پھر میرے نفسِ مضمون نے مجھے اور ڈھیل دیدی۔ گو اَب تو میں نے محسوس کرلیا ہے کہ خالص نفسیاتی اور تحلیلی افسانہ اپنی منطقی حدوں تک پہونچکر جاسوسی ناول بنجاتا ہے جس میں دلچسپی کے عناصر نہیں ہوتے یا [illegible] کی ایک پُر تصنّع شکل، لیکن میرے افسانے ابھی تک تحلیل ہی کی طرف مائل رہے ہیں۔ اور تحلیل اور ہیئت میں بیل مارے کا بیر ہے۔ جدید نفسیات نے آرٹ میں ہیئت کی بُنیادیں کھود ڈالی ہیں، کیونکہ اُس کے نزدیک انسانی زندگی نام ہی ہے ناہمواری، بے ترتیبی اور غیر تسلسل کا۔ یہاں "کجا از کجا تا خفتن" کی پوری اجازت ہے، اور لفظ [illegible] کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یا ہمواری، ساخت، تعمیر اور مجسمہ سازانہ ڈھلائی کا نام نہ لیجئے، یا حقیقت نگاری سے کنارہ کش ہو جایئے۔ اس نظریئے میں حقیقت ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا نام لیکر ہر لکھنے والا فنّی خامیوں کے الزام سے بچ سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے مواد اور مضمون کو جانچنے تولنے، اور اُسے ایک وحدت کی شکل میں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی؛ ہر بات جو آپ کو چلتے پھرتے یاد آجائے کھپ سکتی ہے ــــ عمرعیار کی زنبیل میں ہر چیز کے لئے جگہ ہے۔ میں اپنے ہی افسانوں میں سے ایک مثال پیش کر سکتا ہوں۔۔۔۔ مگر، جانے دیجئے، پھر آپ میرا اگلا مجموعہ نہیں خریدیں گے۔۔۔" میرے افسانوں میں کم سے کم پلاٹ ہونے کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کاش کہ ہوتا! تب شاید میرے افسانوں کی ہیئت کچھ بہتر ہوتی، کیونکہ بھرتی کی گنجائش کم رہ جاتی۔ اور درحقیقت فنّی نقطۂ نظر سے میں بہ نسبت اور افسانوں کے "ایک معمولی خط" سے

زیادہ مطمئن ہوں۔ یہ کچھ اور بہتر ہوتا اگر یہ ریڈیو کے لئے نہ لکھا جاتا۔ یہ افسانہ میں نے والٹیئر، مولیئیر، اناتول فرانس اور استاں دال کے تازہ اثرات کے ماتحت لکھا تھا چنانچہ یہاں میں اپنے مواد پر پوری طرح قابض ہوں، حالانکہ اور سب افسانوں میں میں نے اپنے آپ کو مواد کے قبضے میں دیدیا ہے۔ تجربے اور محسوسات پر یہی قادرانہ غلبہ ادب کی جان ہے۔ اگر بالزاک کے محاوروں کا ایسا ٹھیٹ ترجمہ آپ کو گراں نہ گزرتا ہو تو مجھے کہنے دیجئے کہ کام اسی وقت بنتا ہے کہ جب چیخ چہاخ کی پروا نہ کرے، بس دبالے۔ (لیکن ذرا گنئے کہ ایسے مرد آہنکل ہیں کتنے — صرف ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ مغرب میں بھی)۔ ... اس مذکورہ افسانے کے علاوہ "حرام جادی" کے آدھے حصے کو پڑھ کر میں کئی دفعہ جھوم چکا ہوں۔ شاید اس کا باقی حصہ بھی اچھا ہوتا اگر میں اپنے کردار کے خیالوں کی رو کا پیچھا کرنے لگتا، بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتا۔ لیکن مجموعی طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے افسانوں میں ہیئتی حسن پیدا کرنا تو الگ رہا، باوجود اس کے متعلق بہت کچھ پڑھ چکنے کے میں دوسروں کی تحریروں میں بھی اسے نہیں پہچان سکتا۔ اُن تمام نظموں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سے جو آج تک میں نے پڑھے ہیں، صرف ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی رُوح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے، اور اتنی شدید طور پر کہ اُس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں۔ اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹریس" ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے۔ اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کرسکوں، لیکن کہیں بھی ٹوٹی ڈگڈگی سے "نغمۂ سیارگاں" نکلا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بیجا نہ ہوگا کہ میرا افسانہ "حرام جادی" چیخوف کے اسی افسانے سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہو تو اُسے جمالِ ہم نشیں کا عکس ہی سمجھئے۔ اسی طرح "چائے کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُسنِ معنوی ہو یا حُسنِ صوری سب رُوح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ کسی لکھنے والے میں سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کتنی گہرائی سے بول رہا

ہیں لیکن نہ تو میرے دماغ کو باریکیوں اور لطافتوں کی سمجھ ہے، اور نہ میری رُوح میں گہرائی ہے ـــــ اور نہ قوت۔ ممکن ہے کہ آپ کو کبھی کبھی میری آواز گہرائیوں میں سے آتی معلوم ہوتی ہو۔ دُرست ہے۔ مگر یہ آواز ایسی ہی ہے جیسی لحاف اوڑھ کر نکلتی ہے۔ واقعی اس تمام عرصے میں لحاف اوڑھے ہوئے تھا۔ خون کی گرمی اور جوش کا لحاف ـــــ اور پھر اُوپر سے اس زمانے کی نیم گرم اور سیلی سیلی بھاپیں جو جسم اور آنکھوں پر چربی کی طرح چھا جاتی ہیں۔ (میں لحاف کا استعارہ استعمال تو کر گیا ہوں، لیکن اب مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں اسے عصمت چغتائی کے "لحاف" پر طنز نہ سمجھ لیا جائے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔) ادب کے موجودہ جنسی ہیجان کا جواز موجود تھا، لیکن بڑی حد تک یہ طوفان لوگوں نے خود اپنی پھونکوں سے بنایا ہے؛ اور اس طوفان نے درخت اور مکان نہیں اکھاڑے ہیں بلکہ ـــــ مُرغی کے پر۔ اس طوفان نے فائدہ بھی پہونچایا ہوگا، مگر اس شُوں شُوں پھُوں پھُوں میں بہت سے نغمہ ہائے زیرلبی دب گئے ہیں۔ ادب میں جنس کا ذکر بذاتِ خود بُری چیز نہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں جنسی عامیانہ پن ذہنی تندرستی کا نشان ہوتا ہے ـــــ مثلاً یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں، چوسر جھجکے بغیر بڑھئی اور چکی والے کے قصّے لکھ سکتا تھا، اور ساتھ ہی کنواری مریم کی تعریف میں ایک نظم بھی۔ ہم لوگ تعریف تو شاید جنسی فعل کی بھی نہیں کرسکتے ـــــ اس کو لُطف تک نہیں لے سکتے ـــــ، ہاں، کوئی "گندی بات" کہنے کے بعد سر پھرا پھرا کر دیکھتے ہیں کہ لوگ اس سے چونکے بھی یا نہیں۔ (مجھے بار بار انتباہ کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ میں کہیں بھی مخصوص افراد پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں تو صرف ایک عام ادبی فضا کی بحث ہے۔ ورنہ موجودہ بہترین جنسی افسانوں کی اہمیت کا میں بھی اتنا ہی قائل ہوں جتنا کہ اور کوئی۔) گندی سے گندی بات اچھے سے اچھا ادب بن سکتی ہے، مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ کیونکہ بڑے ادب کی پیدائش کے لئے ہر قسم کا نسائی اور مجہول انفعال ایک رکاوٹ ہے، اور خصوصًا جنسی جذبے کے سامنے انفعال۔

میں نے جنسی جذبے کی مدافعت کرنے کی کوشش تو ضرور کی ہے، مگر کئی دفعہ میں اس سے دب گیا ہوں، اور اس پسپائی میں مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش کا بھی تھوڑا سا دخل تھا۔ مگر "پھسلن" کی تہ میں اس قسم کی کوئی پسپائی یا خواہش نہیں تھی۔ یہ افسانہ میں نے اُس زمانے میں لکھا ہے جب میں زولا کو بہت بڑا مصنّف سمجھتا تھا، اور غیر مشروط حقیقت نگاری، خارجیت اور معروضیت میرا مطمح نظر تھیں۔ اور نہ میں نے ایسے فوراً مقبول ہو جانے کی تمنا میں لکھا تھا۔ اس قسم کی آرزو تو کجا، اُس وقت تو مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں افسانہ لکھ بھی سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس افسانہ کا مصنّف کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں آتی۔ لیکن "چائے کی پیالی" ضرور فحش نگاری (Pornography) کی حدود میں آجاتا ہے۔ اس کے بعض حصّے پڑھتے ہوئے مجھے خود شرم آنے لگتی ہے۔ اگر اس افسانے کی مجموعی کیفیت کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو ـــــ روحانی فیل پا۔ اسے پڑھکر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چار آنے والے تھیٹر کا مسخرا سٹانڈ پر بانس پیٹ پیٹ کر اشتہار دینے کے لئے اپنے پاس کھڑی ہوئی عورت کے کپڑے اتارنا شروع کر دے ـــــ ایک کے بعد دوسرا ـــــ اور دونوں میں سے کوئی بھی شرم نہ محسوس کرے، بلکہ مسکراتے رہیں۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ قمیص کے نیچے سے کپڑے کی دو گیندیں نکلیں ـــــ جو ننگی عورت سے بھی زیادہ فحش چیز ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ افسانہ غیر حقیقی ہو۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی اصلی لڑکی کے خیالات اس سے بھی زیادہ جنسیت لئے ہوئے ہوتے۔ تو نفس مضمون میں تو کوئی سُقم نہیں، مگر اس کے بیان میں کچھ میرے ہی قدم ڈگمگا گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ کچھ ہو گا۔ مگر اشارۃً کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُسی قسم کی جذباتی کیچڑ ہے جس میں گالز ورذی کو لوٹتے ہوئے ڈی ایچ لارنس نے پکڑا تھا۔۔۔ یہ جنسیاتی رجحان ہی ہے جس نے اکثر جگہ میرے افسانوں میں "جھوٹے سُر" (false notes) پیدا کر دئے ہیں، اور میری ٹکنیکی

اور ہیئتی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا ہے۔ شاید رگوں میں ٹھنڈک پڑنے کے بعد میں فن اور ہیئت کی طرف زیادہ کامیاب توجہ کر سکوں گا۔ لیکن چونکہ میرا ادبی سرمایہ زیادہ تر جلسی قسم کا ہی ہے، اس لئے یہ بھی اندیشہ ہے کہ خون کا دباؤ اور اعصاب کا تناؤ کم ہو جانے کے بعد میں اچھا فنکار تو ہو جاؤنگا، مگر شاید پھیکا، پھسپھسا بھی رہ جاؤنگا۔

آپ رُوح کا نام سُنتے سُنتے گھبرا گئے ہونگے، کیونکہ یہ کوئی چٹپٹی چیز نہیں ہے لیکن میں ایک مرتبہ پھر یہ لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ تو اِن ساری کمزوریوں کی جڑ یہ ہے کہ نہ تو میری رُوح میں شدّت ہے، نہ میرے جذبات میں گہرائی، اور نہ مجھے اُن پر اعتماد۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں لوگوں کو صرف سادہ پانی سے مطمئن کر سکوں گا، اس لئے میں نے اُس میں تھوڑی سی شراب بھی ملائی ہے، کچھ تو رسیلے جذبوں کی، اور کچھ الفاظ کے شد و مد کی۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ روحِ عصر کے اظہار کے لئے سرسامی اور وحشیانہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی مَیں اس مقولے کی سچّائی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "دیوتا گہرائی چاہتے ہیں، روحانی آشوب نہیں" ــــــ اور خصوصًا ادب کے دیوتا۔ جو لوگ محسوس کرتے ہیں وہ لفظوں کے زور و شور کی مدد نہیں مانگتے۔ شدّتِ احساس، خلوص، جذباتی واقعیت اور بیان کی قطعیت کے لحاظ سے ورڈز ورتھ کی اِس ایک لائن کے مقابلے کی مثالیں کم ہی مل سکتی ہیں:-

"And oh, the difference to me."

مَیں اس صفت کی تعریف تو کر سکتا ہوں، مگر اِسے اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دراصل مَیں سطحیت پسند واقع ہوا ہوں۔ مجھے کسی چیز پر کافی حد تک یقین ہی نہیں ہے۔ جب یقین نہیں تو تخلیق کہاں! اسی لئے الہام و انکشاف کا احساس Sense of Revelation جو ادب کے لئے اتنا ضروری ہے میرے صفحوں میں نہیں ملتا۔ ای ایم ([illegible]) نے کسی کے متعلق کہا تھا کہ اُس کے اندر اتنا ہیجان (Chaos) ہی نہیں ہے کہ کائنات

(Cosmos) بنا سکے۔ یہی میرے اُوپر بھی صادق ہے۔ میری رُوح میں بھی اتنا ہیجان نہیں ہے — صرف چائے کی پیالی کا طوفان۔

میں نے پلاٹ کے متعلق کچھ کہنا شروع کیا تھا، مگر پھر میں دوسری طرف بہک گیا۔ میرے افسانوں میں پلاٹ کم سے کم پایا جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی مبارکباد کے قابل چیز ہے یا نہیں۔ لیکن ایسا ہونا دو وجہ سے ناگزیر تھا۔ میرے زیادہ افسانے طالب علمی کے زمانے کے ہیں جب انسان کی پوری طبعی عمر اور اُس کے متعلقات نظر کے سامنے نہیں ہوتے بلکہ چند مخصوص کیفیتیں۔ پھر میں متوسط طبقے کا ترجمان ہوں جہاں روحانی حیثیت سے فیصلہ کن واقعات ہوتے ہی کم ہیں بس وہی بے رنگ ہمواری اور یکسانی — زندگی کی، اور رُوح کی۔ میرے افسانوں میں پلاٹ کم ہے، کیونکہ ہماری زندگی میں بھی پلاٹ غائب سا ہو گیا ہے، یعنی اُس کی جذباتی اہمیت۔"

"میرے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل بھی کی جائے گی، اور اُن کے ساتھ میری بھی۔ میرے کرداروں کا نفسیاتی ٹائپ کافی سیدھا سادا ہے: وہی معمولی داخلیت، میلانِ ہم جنسی، ماحول سے بیزاری، اور حقیقت سے فرار وغیرہ۔ اور مرکب ای ڈیپس تو ان کے پیچھے پیچھے آتا ہی ہے۔ میرے افسانے زیادہ تر اسکول کی لڑکیوں کے مطالعے ہیں: میرا روحانی قد و قامت بھی بس اسی قدر سمجھئے، اور اگر آپ نفسیاتی تحلیل کے شوقین ہیں تو اس میں — arrested development اور regression اور شامل کر ہی لیں گے۔ عموماً میرا موضوعِ سخن شکست (— frustration) اور زمانۂ بلوغت کی ماحول سے بے اطمینانی اور اُس کے خلاف احتجاج و گریز رہا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے مجموعے کا نام پہلے "گھٹن گھٹن" تجویز کیا تھا۔ میں تو کیا، آج کل ساری دُنیا کا ادب اسی احاطہ میں محدود ہے: آج کل کی بڑی سے بڑی شاعری میں بھی یہی گھٹن گھٹن ہے۔ (مقابلے کے لئے دیکھئے ٹینی سن)۔

"A child crying in the night,
A child crying for the light,
(And in no other language than a cry."

اسپینڈر کو تو ادب کی اس بلوغت پر ناز ہے، کیونکہ انہوں نے اس کا نام بغاوت رکھا ہے۔ مگر میری پیاس محض بغاوت، محض بت شکنی سے نہیں بجھتی۔ لیکن میری، ایک فرد کی، پسند یا ناپسند سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہم سب اپنے نظام زندگی کی بندشوں میں اسیر ہیں۔ آجکل اپنی روحانی ترقی کو یہاں رکتے دیکھنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہماری زندگی جو نغمہ پیدا کر سکتی ہو وہ بس یہی ہے—— بھن بھن۔

کردار میرے کرداروں کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے تنہائی کا احساس۔ یہ ہے میرے مجموعے کی وجہ تسمیہ۔ یہ نام میں نے میتھیو آرنلڈ کی ایک نظم سے لیا ہے جہاں اس نے انسانوں کو زندگی کے سمندر میں الگ الگ جزیرے کہا ہے۔ تقریباً پچھلے دو سو سال سے یورپ کا ہر بڑا ادیب اور شاعر اسی ایک جذبۂ تنہائی کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ یہ حسرت اور ناامیدی بتدریج یہاں تک بڑھتی چلی گئی ہے کہ آخر ڈی ایچ لارنس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تنہائی ہی زندگی کا اصول ہے۔ اٹھارویں صدی میں Rousseau نے اس قول میں کہ صرف ایک بدمعاش آدمی ہی اکیلا ہوتا ہے، کچھ اصلیت ہو سکتی تھی لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے بہترین آدمی، بلکہ آرنلڈ جیسے لوگ جنہیں اپنے زمانے کا اخلاقی شعور کہنا بجا ہے، اسی احساس تنہائی سے اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس کرتے رہے ہیں۔ "تنہائی اور تغیر" —— یہ ہیں ہمارے زمانے کے دو سب سے بڑے موضوع۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے موافق کوئی علاج سوچنے کی کوشش کی ہے مگر سب بے سود۔ مارسل پروست نے تو خیر مدافعت ہی چھوڑ دی تھی، اور نظام زندگی کے مقابل انسان کو ایک ذرۂ بے مقدار تسلیم کر کے اپنی روح پر رنج و حسرت، مایوسی و بیچارگی کے زہرہ گداز

جذبوں کا مستقل بوجھ قبول کرلیا تھا۔ وہ سرتاپا ایک ماتمی نغمہ رہ گیا تھا۔ "sses ریگریسز" میں بھی کسی ساتھی کی تلاش میں رُوح کی سرگردانی دکھائی گئی ہے؛ مگر آخر میں ساتھی ملتا بھی ہے تو پہچانا نہیں جاتا ——— اور پھر وہی سمندر دونوں جزیروں کے درمیان لہریں لیتا ہوتا ہے۔ شاید آخری پچاس صفحوں میں حقیقت نگاری نہیں کی گئی ہے، بلکہ جوئس نے اپنی رُوح کے احساسِ شکست کو میرین بلوم کے مشتعل جذبات میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے اپنے درد کا مداوا جنس میں ڈھونڈنا چاہا، لیکن اُس نے آگ اور بھڑکا دی۔ تنہائی شاید ہی کہیں اتنی ہیبت ناک ہو جتنی لارنس کے یہاں۔ کم سے کم انگریزی ادب میں تو نہیں؛ فرانس کے کسی مصنّف کے یہاں ہو تو ہو۔ اور تو اور ڈبلیو بی ییٹس کو بھی، جسے عوام کی رُوحانی قوت کا پورا احساس تھا، یہی عارضہ لاحق تھا اور اُس نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ موجودہ زمانے میں پُرخلوص اور حقیقی ادیبوں کے لئے تنہائی کی زندگی بسر کرنا ناگزیر ہے۔ جن معاشی، سماجی، ادبی اور نظریاتی اسباب نے اخلاقی اور روحانی تجرّد کی یہ فضا یورپ میں پیدا کی تھی، اُن کا عمل اب ہندوستان میں بھی شروع ہوگیا ہے۔ یہ تو میں کبھی نہیں مانوں گا کہ ہندوستان کے عوام اس اثر کو ڈیڑھ سو دوسو سال سے پہلے قبول کرسکتے ہیں۔ بلکہ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ دُنیا کے کسی مُلک کے عوام اس ذہنیت کو اپنے اُوپر حاوی ہونے دیں گے۔ بہرحال ہمارے متوسط طبقے کی زندگی اُن خارجی اسباب کے عمل سے کافی حد تک متاثّر ہوچکی ہے۔ اسکے علاوہ اس رجحان نے اس وجہ سے اور بھی قبل از وقت ترقی پائی ہے کہ ہمارے ادب کے غالب عنصر کا ذہنی پس منظر اور ماحول بحیثیّت مجموعی صدی مغربی ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ اگر مغربی ادب نہ پڑھا جاتا تو یہ روحانی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ محض معاشی حالات، سماجی تبدیلیاں، نیا سائنس اور فلسفہ اِسے جنم دینے کے لئے کافی تھے۔ مجھے اُردو شاعری کی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت نہیں ہے، اور نہ میں سوچے سمجھے بغیر کوئی

رائے دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر تاریخی اور تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ غزل کی شاعری میں بھی اس قسم کے عناصر مل سکیں ـــــ کم سے کم غالبؔ کے یہاں تو ضرور۔ اور موجودہ شاعری میں تو کم و بیش ہر شاعر ہی تنہائی اور تغیّر کے جذبوں سے اُلجھا ہوا نظر آتا ہے ـــــ خواہ یہ جذبات کسی شاعر کے یہاں ابھی تک سطح کے نیچے ہی ہوں۔ بہر حال فیض احمد کی "تنہائی" اس سلسلے میں آخری اور قطعی چیز ہے۔ تنہائی کے جذبے کو سقیم اور مجنونانہ تو میں بھی بنا سکتا ہوں، مگر حسرت اور مایوسی کا ایسا متوازن اور پُر وقار اظہار مشکل ہی سے مل سکے گا۔ ن۔م۔ راشدؔ تنہائی اور تغیّر کا زیادہ ذکر تو نہیں کرتے، مگر اُن کی مایوسی، شکستگی اور کلبیت کی تہ میں یہی جذبے کار فرما ہیں۔ میراجی بھی قفس میں پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ مگر اُردو افسانے میں اِن جذبوں کو براہِ راست اظہار کا موقع نسبتاً کم ملا ہے، گو شکلیں بدلے ہوئے وہ اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔ ہاں، سعادت حسن منٹو نے اکثر تنہائی کے احساس کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ اور میرے زیادہ تر افسانے بھی ان ہی محوروں پر گھومتے ہیں ـــــ علیٰحدگی اور تنہائی کا احساس اور سال و ماہ کی لرزہ خیز تبدیلیاں۔ اس طرح اپنا نام چھانٹ کر پیش کر دینے کو تعلّی نہ سمجھئے، کیونکہ ان احساسات سے متعلق ہونا میں اپنے لئے کوئی فخر کی بات نہیں سمجھتا۔۔۔۔ اِسے قابلِ فخر بات سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے، لیکن اِن کی غلامی کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ نفسیاتی تحلیل کے گرویدہ لوگوں کے نزدیک تو یہ مرکبِ ای ڈیپس کی علامات ہوں گی، اور انہیں تحلیل سے دُور کرنا ممکن ہوگا۔ لیکن میں "پُرانے خیال کا بُزرگ" رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ شاید یہ عناصر اُس وقت تک ادب پر غالب رہیں گے جب تک کہ دُنیا کے نظام میں بُنیادی تبدیلیاں واقع نہ ہوں، اور اخلاقی اقدار پھر سے قائم نہ ہو جائیں۔ اُس وقت تک اپنی اپنی جگہ یونہی گڑے رہیں گے یہ جزیرے۔۔۔۔ شاید کنولوں کا استعارہ زیادہ موزوں ہوگا

جو جھیل کی سطح پر بہتے رہتے ہیں، اور کبھی کبھی ہوا کے جھونکے انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ جانے وہ لہر کب آئے گی جو انہیں ملا دے!

اور ان دو جذبوں کے پیچھے اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں، "ناقابلِ بیان افسردگی، بے حد و حساب دیوانگی، ناقابلِ علاج مایوسی" بے نام خوف، مبہم تمنائیں، کبھی سیر نہ ہونے والی آرزوئیں ـــــ اور عصبی خلل۔ یہی وہ مدارج ہیں جو مغربی ادب نے رومانیت سے بغاوت کے بعد طے کئے ہیں۔ جو ادبی تحریک انتہائی حقیقت پسندی کے دعووں کے ساتھ شروع ہوئی تھی وہ انتہائی دیوانگی پر ختم ہوتی ہے۔ کم و بیش یہی رجحان اردو کی نئی ادبی تحریک کا بھی ہے۔ ہم لوگ صرف اور محض حقیقت نگاری سے ہٹتے ہوئے وہاں آ رہے ہیں جہاں محسوسات کا بیان نہیں کیا جاتا بلکہ محسوس کرنے والے اعصاب پر اُن کے اثر کا؛ جہاں جذبات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ خالص جذباتی فضا ـــــ "جذباتی میدان" ـــــ سے۔ میں پھر اپنا نام لینے پر مجبور ہوں، مگر محض مثال کے لئے۔ اس "ترقی" کا آغاز و انجام آپ میرے موجودہ مجموعے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا پہلا افسانہ بہت ہی بیدار حقیقت نگاری ہے، اور آخری افسانہ خالص عصبی فساد۔ اس افسانے میں میں نے کوشش کی تھی کہ ٹھوس زمین بالکل نظر نہ آئے؛ صرف فضا ہی قائم رہے؛ لیکن میں اس میں بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ تاہم یہ افسانہ ایک رجحان کی مثال تو بن سکتا ہے.... ہماری ادبی نسلیں "ورتھر" کو مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی ہیں، لیکن دراصل ہم برابر "ورتھر" کے تازہ ترین ایڈیشن پیش کرنے میں مصروف رہے ہیں۔

دراصل ہمارے نظامِ زندگی نے ہمارے اندر ایک زنانہ پن اور انفعالیت پیدا کر دی ہے اور ہمارے وجود کی مرکزیت بالکل غارت ہو چکی ہے۔ اسی نسائیت نے ادب میں تاثریت کو پروان چڑھایا ہے۔ ہم زندگی کو ایک وحدت کی طرح

سوچنے سمجھنے کی تاب نہیں رکھتے؛ ہمیں پینگ میں جھومتے رکھنے کے لئے صرف ایک تاثر چاہیے۔ ہم تاثر کی مدافعت نہیں کرتے، نہ جانچ پڑتال؛ ہر وہ تاثر جو ہوا میں اُڑتا ہوا ہماری طرف آجائے ہم اُسے اپنے اوپر مسلّط ہو جانے دیتے ہیں۔ ہم صرف ایک Aeolian Harp — رہ گئے ہیں۔ کیونکہ تاثریت اپنے انتہائی درجوں پر پہنچ کر — automatism بن گئی ہے — جو نہ صرف ادیب کی شخصیت، بلکہ ادب اور انسانیت کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے۔ ہم نے اپنے آپکو محسوسات کی گزرگاہ بن جانے دیا ہے، اور ہمارے اندر تصادم باقی نہیں رہا۔ اِسی لئے مایوسی اور شکستگی کے اِن انباروں کے باوجود، ہم کوئی حقیقی المیہ پیدا نہیں کرسکتے؛ بقول لارنس کے، ہماری حالت اُس مینڈک کی سی ہے جو گاڑی کے پہیے سے کچل جائے۔ المیہ تو کجا، ہم سے جلیل القدر ادب ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ "عورتنا" ادب کی تخلیق نہیں کرسکتی۔

تو جو کمزوریاں اس زمانے میں کسی ادیب کی ہوسکتی ہیں وہی میری بھی ہیں۔ لیکن کچھ شخصی اور ذاتی بھی۔ مجھ میں زندگی سے لُطف لینے کی تھوڑی سی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن کچھ تو اپنے زمانے کی ادبی انحطاط پسندی سے متاثر ہو کر اور کچھ اپنی عصبی کمزوری سے مجبور ہونے کے سبب مَیں اس صلاحیت سے پورا کام نہیں لے سکا۔ اگر مَیں لے بھی سکتا، تو اس زمانے میں جو "وقت" اور "زندگی" کی چیز ہی نہیں ہے، ادب کی تخلیق کے لئے صرف یہ صلاحیت کافی نہیں ہے۔ آجکل اپنے آپ سے گہرے اور بنیادی اخلاقی سوال پوچھنے لازمی ہیں۔ مَیں اِس ضرورت سے واقف تو تھا، مگر تن آسانی کی وجہ سے مَیں نے روحانی کاوش گوارا نہیں کی، اور بڑے بڑوں کا سر جھکا دینے والے ہمہ گیر سوالات سے جان چُراتا رہا۔ میں نے ہمیشہ روحانی سمجھوتے سے کام لیا ہے۔ یہ چیز اتنی ضرر رساں نہ ہوتی،

اگر مجھے اخلاقی قدروں کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا۔ لیکن میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں دوسری طرف پھیرے رکھی ہیں۔ جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اُس میں خلوص تو ہے، مگر زندگی کے بنیادی مسائل سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے انسان کے لئے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے۔ اور نہ ایسا نیا ہی۔ کیونکہ جو روحانی کیفیتیں میں نے پیش کی ہیں وہ مغربی ادب میں روزمرّہ کی چیزیں ہیں۔ اگر اُردو کے ادیب اسی روش پر چلتے رہے، شاید ہم کبھی بھی کوئی نئی چیز نہیں پیش کر سکیں گے؛ ہاں، مغربی ادب کا مشرقی ایڈیشن ضرور تیار کر دیں گے، گو یہ نقل کسی طرح جھوٹی نہیں ہوگی، بلکہ بالکل پُر خلوص اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی۔ کیونکہ اِن دونوں سرزمینوں کی موجودہ زندگی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔

بہتر ہوگا کہ میں "نئی چیز" کی تشریح بھی کر دوں۔ ادب اپنے فیض کے لحاظ سے تو ضرور بین الاقوامی ہے۔ مگر اُس کی اصل قومی اور نسلی ہوتی ہے۔ آم کھایا تو جا سکتا ہے دُنیا کے ہر گوشے میں، مگر پیدا ہوتا ہے وہ ہندوستان ہی میں۔ کسی قوم کا ادب اُن عناصر ــــــ اُس مخصوص مزاج اور فضا ــــــ کو پیش کرنے کی وجہ سے قابلِ قدر ہوتا ہے جو دُنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اور یہ مخصوص مزاج اپنی روح کو عوام کی زندگی میں رسا بسا لینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمیں دُنیا کے ادب میں اپنی جگہ بنانی ہے تو دُنیا ہم سے وہ مانگے گی جو صرف ایک ہندوستانی دے سکتا ہے۔ لیکن اِسے گُستاخی نہ سمجھا جائے اگر میں یہ کہوں کہ ہم لوگ زندگی کی بہ نسبت کتابوں سے زیادہ متاثّر ہوئے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم نے روحِ عصر کی ترجمانی نہیں کی، ہم صرف اُس رُوح کو نظر انداز کر گئے ہیں جو ماورائے عصر ہے، جو دب تو ضرور گئی ہے مگر عوام میں اب بھی موجود ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خالص ہندوستانی عنصر اتنا دھندلا پڑ گیا ہو کہ اب نظر ہی نہ آتا

ہو لیکن تخلیقی تخیّل Creative imagination کا کام ہی یہ ہے کہ غیر محسوس تاروں کو ایک ایک کر کے چُنے ——— چشم و گوش کی دنیا کو پگھلا کر نامعلوم جوہروں کو تلاش کرے۔ لیکن ہم نے اپنے اس فریضے سے اب تک پہلو تہی اختیار کیے رکھی ہے۔ یہ زندگی کی بہ نسبت ادب سے زیادہ متاثر ہونے کا نتیجہ ہے؛ ہم نے مغربی شعور کو بغیر ناقدانہ نظر ڈالے کلّیتاً قبول کر لیا ہے، بلکہ اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے ——— اور مغربی شعور بھی وہ جو انحطاط پذیر ہو۔ یہ یقیناً روحانی بیچارگی کے مترادف ہے۔ ہم ہر قسم کے تجربے کر رہے ہیں، سوائے رُوحانی تجربے کے، جو سب سے اہم ہے۔ ہم نے بھی زندگی کی عکّاسی کی ہے، ہم نے بھی اُردو ادب کی ترقی میں حصّہ لیا ہے، مگر سرشار، نذیر احمد، سجّاد حسین، بلکہ ستم ظریفی اور میر باقر داستان گو تک کو ہم پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ ہمارے بہ نسبت اس خالص ہندوستانی عنصر سے زیادہ قریب تھے۔ شعور کی تبدیلی تو خیر لازمی چیز تھی، مگر اپنی رُوح کو شعور کی ایک مخصوص کیفیت کا اسیر کر لینا بھی تو کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ جب ہم نے مغربی شعور کو قبول کیا تو واقعی ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ مگر اب یہ شعور خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہا ہے۔ خود مغرب ایک نئے شعور کے لئے مضطر ہے۔ مغربی ادب کی حالت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر یہ نیا شعور کوئی فراہم کر سکتا ہے تو چین یا ہندوستان۔ لیکن ہم خود "کالی عورتوں اور نیلی شراب" والے شعور کے دلدادہ ہو رہے ہیں۔ جنسیت سے مغلوب ہو کر ہم نے قلب کی معصومیت تو کھو ہی دی ہے، مگر احساس کو وسعت دینے کے معنی بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ بیمار اور سقیم احساس کو بڑھانا ——— حالانکہ اُن محسوسات کو جو لوگوں نے کھو دئے ہیں دوبارہ حاصل کر لینا بھی احساس کا دائرہ وسیع کرنا

ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کھوتے ہوئے محسوسات حاصل کر لینے میں موجودہ نظامِ زندگی کیا رکاوٹیں ڈالتا ہے، اور وہ اخلاقی لڑائی بھی یاد ہے جو چیسٹرٹن کو تنِ تنہا لڑنی پڑی، اور جس میں اُسے بظاہر کوئی خاص کامیابی بھی نہیں ہوئی۔ لیکن دلِ ناتواں کا اس طرح مقابلہ کرنا، پن چکیوں پر حملہ بھی داد کے قابل ہے۔ ممکن ہے ہمیں کامیابی حاصل نہ ہو، لیکن روحانی ریاضت کی داد تو لے ہی لینی چاہیئے۔

میں نے کچھ "محراب و منبر" کی سی باتیں کی ہیں، اور بیسیوں دفعہ "چاہیئے" اور "لازمی" جیسے لفظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن یہ اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مجرم اپنے آپ کو ہی سمجھنے کی وجہ سے، اور اپنی روحانی بزدلی جتانے کی خاطر۔ مجھے خود پتہ نہیں کہ یہ خالص ہندوستانی عنصر ہے کیا چیز، لیکن میں اس کا وجود تسلیم کرتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں۔ میرے افسانوں میں یہ احترام اِس شکل میں ظاہر ہوا ہے کہ میرے کرداروں کے نام عیسائی ہیں۔ میں اپنے کرداروں کے ہندو یا مسلمان نام بھی رکھ سکتا تھا، مگر پچھتر فی صدی مغربی شعور کو سو فی صدی ہندوستانی نام دینا ہندوستانی روایتی شعور کی ہتک تھی۔ میں نے عیسائی کردار محض اس وجہ سے چنے ہیں کہ میں ہندوستانی فطرت اور مزاج کی ترجمانی کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوں —— وہ ایک ایسا بھاری پتھر ہے جسے میں نے چوم کر چھوڑ دیا ہے۔ رہا ہندوستانی عیسائیوں سے واقفیت کا سوال، تو وہ مجھے اِسی قدر حاصل ہے جتنی آپ کو...... ممکن ہے کہ میں کبھی ظواہر کی سطحیں توڑتا ہوا اُس ہندوستانی رُوح تک بھی پہونچ جاؤں۔ لیکن چونکہ میں اپنے آپ کو تھوڑا سا جانتا ہوں، اس لئے زیادہ اُمید تو نہیں۔ کیونکہ ظواہر کی چٹانیں صرف دو ہی آلوں سے ٹوٹتی ہیں، محبت اور انکساری

(Love and Humility) محبت تو شاید میں کر بھی لوں، مگر انکساری مجھ سے ممکن نہیں۔ (انکساری کے معنی اپنے آپ کو سب سے چھوٹا جاننا نہیں ہے، بلکہ سب کو اپنے برابر سمجھنا ـــــ اپنی جگہ پہچاننا۔)

میں نے اخلاق اور روح کا اتنی دفعہ ذکر کیا ہے کہ آپ تنگ آ گئے ہوں گے۔ اوّل تو میں اپنے ادبی اثرات کے ماتحت ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ اور پھر شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ آج کل پوری دُنیا میں جاری ہے۔ لیکن "آذری" کا زمانہ آنے تک، کلچر کی حفاظت کے لئے شاید سامیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے ـــــ ادب میں بھی۔

میں نے یہ اختتامیہ جس روا روی اور ہڑبڑاہٹ میں لکھا ہے اُس نے لوگوں کو اور اُلجھا دیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ میں نے ایک آدھ بات کام کی بھی کہی ہو، مگر وہ اتنے بھدّے اور اَن گھڑ طریقے سے کہی گئی ہو گی کہ آپ اُسے میری پریشان خیالی اور ژولیدہ نگاری کے ثبوت میں پیش کر سکیں گے ..... بہرحال اب ایک آخری بات اور اپنے افسانوں کے متعلق کہے دیتا ہوں۔ مجھے چند ایسی ہستیوں سے شرفِ نیاز حاصل ہے جن کی نشوونما کلیتاً ادب ہی نے کی ہے۔ اس لئے میرے پاس ادب کا ایک ہی معیار ہے، وہی چیز ادب ہے جو ایسی ہستیاں پیدا کر سکے۔ اور میرے افسانے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

آپ پوچھیں گے کہ پھر مجموعہ کیوں چھپوایا؟ لیکن اس کا جواب یا تو میرے ناشر دیں گے جنہوں نے میرا مجموعہ خریدا، یا پھر آپ خود جنہوں نے میرے افسانے پسند کیے۔ لیکن اس کے علاوہ میرے مجموعے سے ایک اور بھی توقع ہے۔ بھائی اسے ادب سمجھ کر گھر لے جائیں گے، اور بہنیں اسے فحشیات کے طور پر پڑھیں گی؛ اور کم سے کم اتنا

تو میں بھی مانتا ہوں کہ میرے افسانے آٹھ آنے والے ناولوں اور ایک روپیہ سالانہ چندے والے رسالوں سے تو بہتر ہیں۔

ادب کا ایک اصول اور ہے جو ادیبوں کا سرتاج بتا گیا ہے۔ اگر پڑھنے والے کا تخیل اُسے سُدھارلے تو بُرے سے بُرا بھی کچھ بُرا نہیں۔ اس لئے اپنے آئندہ مجموعے کے خیال سے تو میں یہی درخواست کروں گا کہ آپ ایسے ہی تخیل سے کام لیں۔

محمد حسن عسکری

۳؍ فروری ۱۹۴۳ء